MAY
2024

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ
بیاض
لاہور

یکم مئی

عالمی یوم مزدور

کوئی سِتارہ اُچھال
اجمل اعجاز

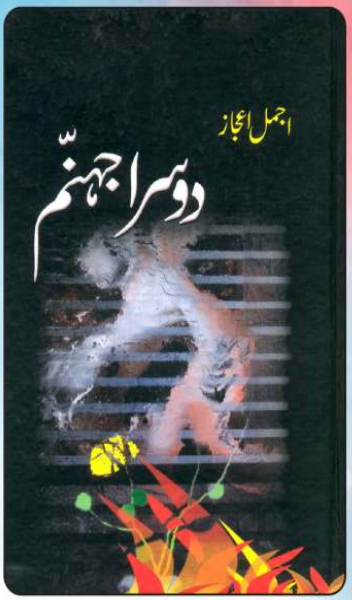
اجمل اعجاز
دوسرا جہنّم

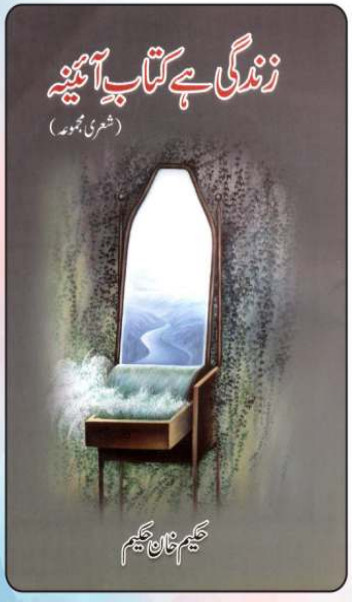
زندگی ہے کتابِ آئینہ
(شعری مجموعہ)
حکیم خان حکیم

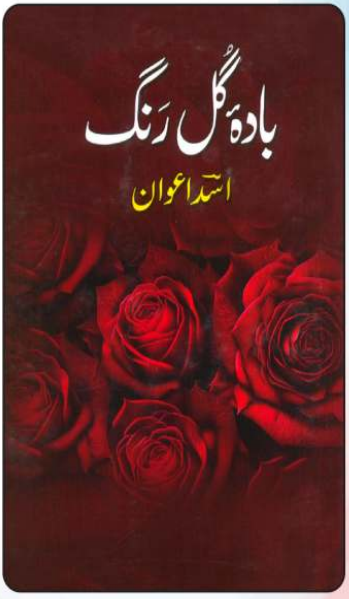
بادۂ گُل رَنگ
اسدؔ اعوان

غزل

اک گام سرِ راہِ سپاس آئی نہ دنیا
دریوزۂ عقبیٰ تھا ، سو ، راس آئی نہ دنیا

محروم رہی صحبتِ مردانِ رضا سے
کس حسن کی وحشت تھی کہ پاس آئی نہ دنیا

ناچی ہے برہنہ سرِ بازار ہمیشہ
اک بار ، تہِ تارِ لباس آئی نہ دنیا

اے راندۂ دنیا تجھے کیا غم کہ مجھ ایسے
پروردۂ دنیا کو بھی راس آئی نہ دنیا

خالد افقِ خاک رہا ، رنگ میں غلطاں
مجھ تک کبھی لے کر تری باس آئی نہ دنیا

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ **بیاض** لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 32 - مئی 2024 - شمارہ نمبر: 5

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران
کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: یومِ مزدور
قیمت: 100 روپے

سالانہ زرِ اعانت 1000 روپے بیرونِ ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-37513000-42-92 فیکس: 37512517-42-92

Email: bayaz@tracknttie.com www.tracknttie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.tracknttie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر نزد معمار ٹیکسٹائل اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	نسیم سحر ، خاور اعجاز ، محمد اشرف کمال	7 تا 9
2	نعت	سید ریاض حسین زیدی، رضا اللہ حیدر، اکرم ناصر اعجاز دانش، سرور حسین نقشبندی، جنید آذر، شہاب اللہ شہاب	10 تا 16
3	عقیدت	افروز رضوی، مرزا آصف رسول، منظر عارفی سید عارف معین بلے	17 تا 23
4	ماہیے	نثار ترابی، سیما پیروز	24 تا 25
5	مضامین	جمیل یوسف، ابدال بیلا، سیما پیروز، دردانہ نوشین خان شاہد اشرف، سعدیہ بشیر، ظفر اقبال ظفر، شہزاد نصور محسن خالد محسن، شکور احسن، سلیم اختر، ثمینہ سید، افتخار شوکت صدام ساگر، محمد نوید مرزا، فیصل زمان چشتی محمد شاہد دھریجہ، عابد سیال، بشیر احمد حبیب، نبیل احمد نبیل	26 تا 107
6	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	108 تا 116

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
7	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، نسیم سحر، سید ریاض حسین زیدی خاور اعجاز، محمد انیس انصاری، راحت سرحدی، صفدر صدیق رضی سید افسر ساجد، گلزار بخاری، باقی احمد پوری، اکرم ناصر، اقبال سروبہ سعد اللہ شاہ، خالدہ انور، افتخار شاہد، ہمایوں پرویز شاہد مظہر امام، طارق بٹ، مسعود احمد، اجمل اعجاز، رضا اللہ حیدر محمد اشرف کمال، اکرم جاذب، طلعت شبیر، احمد جلیل، عاصم اعجاز رخشندہ نوید، اعجاز دانش، محمد شفیق انصاری، شوکت محمود شوکت ارشد محمود ارشد، محمود کیفی، سرور فرحان، اعجاز روشن شاہین عباس، افتخار شوکت، بشیر احمد حبیب، آفتاب خان فیض رسول فیضان، آسناتھ کنول، سعدیہ بشیر، محمد نوید مرزا خلیل جاذب، قمر نیاز، علمدار حسین، محمد اشفاق بیگ صغیر احمد صغیر، اسد رضا سحر، شبیر نازش، مستحسن جامی رخسانہ سمن، عظمیٰ نقوی، حسن پرویز سید، محمد نور آسی، سرفراز عارض فرح رضوی، خالق آرزو، نادیہ سحر، علیم اطہر، عباس علی شاہ ثاقب اصغر علی بلوچ، افضل ہزاروی، اورنگزیب حسام حر دلشاد نظمی، محمد کلیم، عمران ہاشمی، مہر علی، شہباز حیدر شائستہ رمضان، عزیز قدیر مغل، نوید صادق، نعمان منظور	117 تا 189
8	طنز و مزاح / خاکے	اعجاز رضوی	190 تا 193
9	افسانے	بلقیس ریاض، فرخندہ شمیم، رخشندہ نوید، انعام الحسن کاشمیری	194 تا 220
10	نظمیں	جلیل عالی، سید افسر ساجد، صفدر صدیق رضی، محمد انیس انصاری طالب انصاری، گلزار بخاری، ریاض ندیم نیازی، امجد بابر محمود کیفی، صغیر احمد صغیر، ظہور چوہان، نائلہ راٹھور، ظہیر گیلانی کوکی گل، عابد رضا، عائشہ احمد جاوید، عظمیٰ نقوی، امر مبکی، اعجاز رضوی	221 تا 241

حمد

ہے یہاں اَور کون تیرے سِوا؟
اور وہاں اَور کون تیرے سِوا؟

ضَوفشاں اَور کون تیرے سِوا؟
کہکشاں اَور کون تیرے سِوا؟

کون ہے تجھ سا غمگسار کوئی؟
مہرباں اَور کون تیرے سِوا؟

اِس طرف بھی اور اُس طرف بھی تُو
درمیاں اَور کون تیرے سِوا؟

ہر مکاں میں بھی ہے ترا جلوہ
لامکاں اَور کون تیرے سِوا؟

ہر زمانے میں بھی ہے تُو موجود
لازماں اَور کون تیرے سِوا؟

کون ہے بے کنار اَور کوئی؟
بے کراں اَور کون تیرے سِوا؟

اس زمیں پر بھی اور کوئی نہیں
آسماں اَور کون تیرے سوا؟

سبھی پودے گواہی دیتے ہیں
باغباں اَور کون تیرے سوا؟

نسیمِ سحر

حمد

آئی ہے زمانے کی ہَوا آس لگائے
پہلو میں لیے دل کا دیا ، آس لگائے

جاتے ہیں ترے در سے سبھی جھولیاں بھر کے
آتے ہیں ترے در پہ سدا آس لگائے

ہم عاصیوں پر نظرِ کرم اے مرے مولا
ہم بھی ہیں کھڑے روز جزا آس لگائے

تجھ سے جو بندھی ہے ہر اِک احساس کی ڈوری
اِس دہر سے بندہ ترا کیا آس لگائے

مانگے پہ تو دُنیا بھی ہمیں دے گی بہت کچھ
ہم تجھ سے ہیں کچھ اِس سے سوا آس لگائے

نظریں ہیں طوافِ حرمِ پاک میں مصروف
بیٹھی ہے جھروکے میں دعا آس لگائے

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے ارحم راحم ، رحمت کا چھینٹا
تو ہی مالک ہے ، سیدھے رستوں کا

حمد

سر چھپانے کے لیے دھوپ میں گھر دیتا ہے
وہ خدا ہے جو اندھیروں کو سحر دیتا ہے

میرے بگڑے ہوئے حالات سنوارے گا ضرور
وہ جو سوکھے ہوئے پیڑوں کو ثمر دیتا ہے

کس محبت سے وہ سنتا ہے دعائیں سب کی
ٹوٹے پھوٹے ہوئے لفظوں میں اثر دیتا ہے

جستجو اُس کی کہاں بیٹھنے دیتی ہے مجھے
وہ مجھے روز نیا اذنِ سفر دیتا ہے

حوصلہ مند کو مایوس نہیں کرتا کبھی
وہ گزرنے کے لیے راہ گزر دیتا ہے

میرا سرمایہ بنے حمد و ثنا کے آداب
میرا خالق مجھے لکھنے کا ہنر دیتا ہے

رزق دیتا ہے وہ پتھر میں بھی کیڑے کو کمال
پیٹ بھرنے کا پرندوں کو ہنر دیتا ہے

محمد اشرف کمال

نعتؐ

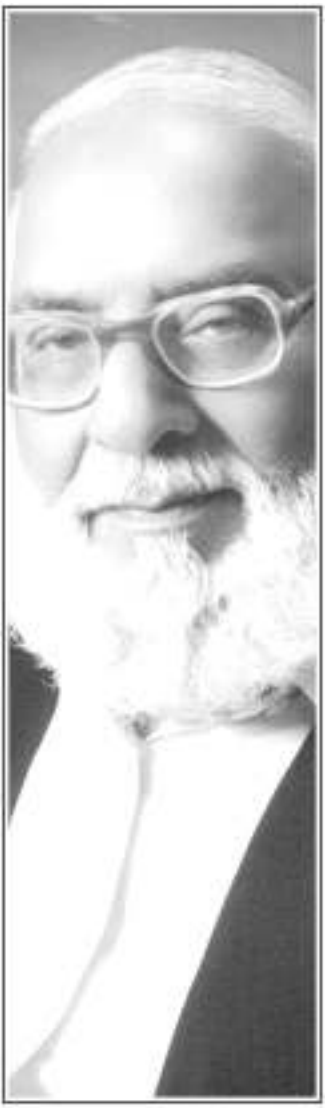

عریاں بدن نے دست کرم سے قبائیں لیں
شہرِ نبیؐ سے حبسِ جہاں نے ہوائیں لیں

یہ معجزہ ہے آپؐ کے اعجاز نطق سے
لب بستہ، گنگ، نوع بشر نے صدائیں لیں

صدیوں کی تیرگی کا مقدر بدل گیا
مہرِ عرب سے سارے جہاں نے شعاعیں لیں

بخشش کا اہتمام، بلا امتیاز ہے
دشمن نے بے دریغ نبیؐ سے دعائیں لیں

جو اقربا تھے، آپؐ کے سانچے میں ڈھل گئے
غیروں نے بھی حضورؐ سے کیا کیا ادائیں لیں

انسانیت کا اجڑا مقدر سنور گیا
تیرہ شبوں نے آپؐ کے دم سے ضیائیں لیں

مجھ کو نہیں تمازت دنیا کا کوئی ڈر
میں نے ریاض شہر نبیؐ سے گھٹائیں لیں

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

خوش بخت ہوں کہ دل ہے طلب گار آپ کا
ہو جائے خواب میں کبھی دیدار آپ کا

پائی نجات آپ کے ہر پیروکار نے
اللہ کا ہوا جو ہے سرکار آپ کا

پوچھو ہزار بار کہ کس کے غلام ہو
آئے گا نام ہونٹوں پہ ہر بار آپ کا

پاتے نہیں اندھیروں میں جب راستہ کوئی
پھر تو سہارا لیتے ہیں اغیار آپ کا

وہ کور چشم ہیں جو انہیں مانتے نہیں
دانش وروں کو آقا ہے اقرار آپ کا

دینے پہ آ گئے ہیں تو بھر دی ہیں جھولیاں
چشمِ فلک نے دیکھا ہے ایثار آپ کا

دل کے مریض آتے ہیں بن بن کے ٹولیاں
بانٹے شفا کی گولیاں بیمار آپ کا

خیرات لینے آئی تھی زلفِ حضور سے
پھرتی تھی رستہ پوچھتی مہکار آپ کا

شاہانِ وقت رشک نہ کیونکر کریں رضا
مجھ بے نوا گدا کا ہے، دربار آپ کا

رضا اللہ حیدر

نعتؐ

لبوں کو چھو کے جو پانی بنا ہو آبِ حیات
اب اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے قند و نبات

حضور آپ کے رستے سے ہٹ کے کیسے چلوں
حضور آپ کا رستہ ہی تو ہے راہِ نجات

حضور آپ کی خاطر ہی تو بنائے گئے
زمین و آسماں یعنی تمام کائنات

حضور آپ ہی کے دین کو ہمیشگی ہے
حضور آپ ہی کے دین کے لئے ہے ثبات

یہ شہر، شہرِ مدینہ ہے، عام شہر نہیں
یہاں سکون سے چلتا ہے کاروبارِ حیات

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سوئے چراغ، تاب و تبِ مہر کھا گئی
لب گنگ اِک سخن میں ہوئے اہلِ فن تمام

نعتؐ

ایک مدت سے ہے دل میں آرزوئے مصطفیٰؐ
جان و دل سے ہے فزوں تر آبروئے مصطفیٰؐ

آپؐ کا فرمان ہے حکمِ شریعت بالیقیں
گویا ہے تفسیرِ قرآں گفتگوئے مصطفیٰؐ

میں تصور میں مدینہ دیکھتا ہوں رات دن
میری آنکھوں کا ہے سرمہ خاکِ کوئے مصطفیٰؐ

حالِ دل ان کو سناؤں گا بصد عجز و نیاز
مجھ کو قسمت نے کیا جب روبروئے مصطفیٰؐ

کس میں ہمت ہے جو آقاؐ کے مقابل آسکے
ہوگئے نابود دنیا سے عدوئے مصطفیٰؐ

آپؐ کے دیدار کو آنکھیں ترستی ہیں مری
خواب ہی میں دیکھ لوں میں کاش روئے مصطفیٰؐ

دشمنانِ دیں کو بھی دانش ہے اس کا اعتراف
سارے عالم سے جداگانہ تھی خوئے مصطفیٰؐ

اعجاز دانش

نعتؐ

بہ لحنِ دیدۂ پرنم سخن تراش ہوا
حضورِ شاہ میں جس دم سخن تراش ہوا

ثنا کی راہ میں "لاترفعوا" تھا پیشِ نظر
اسی لیے تو میں مدھم سخن تراش ہوا

یہ احتیاط مجھے نعت نے سکھائی ہے
میں زود گو تھا مگر کم سخن تراش ہوا

بسایا دیدہ و جاں میں جمالِ شہرِ نبی
پھر اس کے بعد میں پیہم سخن تراش ہوا

فضائے طیبہ نے کھولے خیال کے روزن
نبی کے شہر کا موسم سخن تراش ہوا

جب ان کا ذکر کیا تو درود لب پہ رہا
وہ یاد آئے تو دم دم سخن تراش ہوا

کرم فروز تھی پچھلے پہر کی مشقِ سخن
سو میری آنکھ کا زم زم سخن تراش ہوا

کسی پہ ان کی حقیقت نہ کھل سکی سرور
یہاں تو ہر کوئی مبہم سخن تراش ہوا

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

طے کہاں یہ مرحلہ عزمِ دوامی سے ہوا
سرخرو میں دہر میں تیری غلامی سے ہوا

تیری آمد پر زمین و آسماں ہیں سجدہ ریز
جشنِ استقبالِ تو حق کی سلامی سے ہوا

مرحبا! اے صحنِ ہستی کی تروتازہ بہار
یہ جہاں سرسبز تیری خوش خرامی سے ہوا

باغِ ہستی مشکبو ٹھہرا ترے اخلاق سے
خوش تکلم نطق تیری خوش کلامی سے ہوا

کی عطا سرکار نے مجھ کو حدیثِ دلبری
اُن کے لطفِ خاص سے میں خاص عامی سے ہوا

بس گئی ہے روزِ اوّل سے سماعت میں مٹھاس
آشنا ایسا ترے اسمِ گرامی سے ہوا

تھی دمِ آخر لبوں پر آیتِ صَلُّوا عَلَیہِ
میں تمام ایسا ادائے نا تمامی سے ہوا

جنید آذر

نعتؐ

یہ دلِ ناداں کرے گا کیسے قسمت کا گلہ
مصطفیٰ کا در تو ہے سب کے لئے دارالسخا

میں نے جب جب بھی زباں سے اسمِ احمد پڑھ لیا
دل کے باغیچے میں مہکاتا ہوا غنچہ کھلا

نسبتِ احمد سے ہی اب میں شفاعت پاؤں گا
مجھ فقیرِ در کو اب کیا چاہئے رب سے صلہ

مصطفیٰ کا ذکر کرتے آنکھ جب میری لگی
دور تک آیا نظر جنّت کا سارا راستہ

میں ہوں عشقِ مصطفیٰ میں اِس طرح ڈوبا ہوا
ہو نہیں سکتا فنا چاہت کا اب یہ سلسلہ

دل اگر محروم ہو احمد کی الفت سے کبھی
دل نہیں وہ تو پرندوں کا ہے ٹوٹا گھونسلا

مہر دل پر جب شہابؔ اللہ نبی کی لگ گئی
دل میں ہے ممنوع اُس دم سے سبھی کا داخلہ

شہاب اللہ شہاب

دعا

گونجی یہ ساعت میں فقط ایک صدا ہے
وہ میرا خدا ،میرا خدا ،میرا خدا ہے

میں کر نہ سکی شکر ادا اس کی عطا کا
اس نے مری اوقات سے بڑھ کر ہی دیا ہے

دربار میں اس کے ہو اگر حمد یہ مقبول
میرے لیے کیا اس سے بڑی اور عطا ہے

کیا اس کی عطاؤں کا کروں ذکر میں افروز
چلنے کو ہدایت پہ یہ قرآن دیا ہے

راضی ہو خدا اور نبی میرے عمل سے
افروز کی دل سے تو فقط ایک دعا ہے

افروز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ واحد دردی ، سب مظلوموں کا
وہ منصوبہ گر ، کل منصوبوں کا

عقیدت

زہے صبا! کہ ہے تیرا گزر مدینے میں
مرا بھی حال وہاں عرض کر مدینے میں

فلک پہ ہے جو مقام ان کا وہ خدا جانے
ہے اس زمیں پہ محمدؐ کا در مدینے میں

حضورِ سیدِ کونین مجھ سے پہلے مری
ہے کیا نصیب کہ پہنچے خبر مدینے میں

مدینہ آئنہ، روز و شب ہے اور یہ زیست
ہے کیا ہی خوب کہ ہو خود نگر مدینے میں

نہ بے مراد رہوں میں نہ در بدر ہی پھروں
جو عمر اُن کے ہو در پہ بسر مدینے میں

خیالِ طیبہ کہاں میرا انہماک ہے کیا
مدینے ہی سے ہیں یہ دل نظر مدینے میں

وہی تتمۂ دوش اور بنائے فردا بھی
ہے دینِ حق کا جو عہدِ ظفر مدینے میں

ملا ہے گوش و نگہ کو کہاں؟ تقدس وہ
ہے جیسی عفتِ سمع و بصر مدینے میں

ہے شاہد اِس پہ بھی اسریٰ بعبدہ لیلاً
ہے ایک اور علو نقش گر مدینے میں

کہ توڑ دے گی وہ ہر ایک بت کا سر آخر
جو پہلی زد پڑی طاغوت پر مدینے میں

نقوشِ یثربِ کنتم علی شفا حفرہ
کیے ہیں عشق نے زیر و زبر مدینے میں

منور ایسی ضیا سے ہوئی حیات جسے
سلام کرتے ہیں شمس و قمر مدینے میں

محبت اس کی جہاں ساز ہوگی اتنی ہی
کہ دل لگائے کوئی جس قدر مدینے میں

وفا ہو عہدِ علیکم بسنتی پھر یوں
تھے جیسے عہد و وفا راہبر مدینے میں

صدائے لب پہ بھی لاترفعوا کی حد ہے یہاں
نہ صوتِ دل بھی ہو صوتِ دگر مدینے میں

گدائے کاخِ کرم جائے، کیوں کہیں آصف!
ہے آستانِ شہِ بحر و بر مدینے میں

مرزا آصف رسول

مناقب بزرگانِ صاحبِ عشرۂ مبشرہ

حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ (وفات جنگِ جمل)

یارب ! ہے دُعا تجھ سے بصد دیدۂ نم
جاری رہیں مجھ پر ترے الطاف و کرم
سچائی سے دانائی سے اخلاص کے ساتھ
طلحہ بن عبید اللہ کی مدحت ہو رقم

....

گھبرا کے پکڑتا ہوں جبیں کو اپنی
پڑھتا ہوں درود اور کبھی نادِ علی
مدّاحیِ طلحہ کا سفر ہے در پیش
مولا ! میں طلب گار مدد کا ہوں تری

....

ایقاں ہو تو جنت کا وسیلہ بھی ہیں
ایماں ہو تو عقبیٰ کا اثاثہ بھی ہیں
منظر ! ہمیں معلوم ہے، ہم جانتے ہیں
دس جنتی اصحاب میں طلحہ بھی ہیں

....

کھلتا ہے اِسی سے، کہ وہ کتنے ہیں سعید
جنت کی ملی جیتے جی آقا سے نوید
زخمی ہوئے جب جنگِ اُحد میں طلحہ
بخشا لقب آقا نے انہیں ''زندہ شہید''

....

ممکن نہیں یہ مہر کبھی گہنائے
ممکن نہیں یہ پھول کبھی مُرجھائے
وہ دور، جو اسلام کا تھا اوّلیں دور
صدیق کی دعوت پہ یہ ایماں لائے

....

ایثار و سخاوت میں تھے آپ اپنی نظیر
محبوبِ خدا کے تھے دل و جاں سے اسیر
اسلام کی تاریخ سے ملتی ہے سند
کم مکے میں تھے حضرتِ طلحہ سے امیر

....

یہ قرض بھی مقروضوں کا کرتے تھے ادا
غربت زدہ بیواؤں پہ تھی اِن کی سخا
جو بچیاں لاچار نظر آتی تھیں
شادی کا بھی بار اُن کی اُٹھاتے طلحہ

....

بچوں میں وہ اپنے تھے نہایت محبوب
بیوی کی محبت کے تو تھے ہی مصلوب
مکّے کا ہر اِک شخص اُنہیں کہتا تھا
طلحہ بن عبید اللہ تو انسان ہیں خوب

.....

اسلام میں جب ہو گئے داخل طلحہ
ہر کافرِ مکّہ ہوا دشمن اِن کا
کفّار نے کیا کیا نہ دی ایذا اِن کو
اسلام کی تاریخ میں سب کچھ ہے لکھا

.....

پیار اِن سے رسولِ دوسرا کو تھا بہت
ناز آپ کو حاصل رہا آقا کا بہت
رشک آتا ہے طلحہ بن عبید اللہ پر
خالق نے اِنہیں کیا نہیں تھا بخشا بہت

.....

پیار اِن سے رسولِ دوسرا کو تھا بہت
ناز آپ کو حاصل رہا آقا کا بہت
رشک آتا ہے طلحہ بن عبید اللہ پر
خالق نے اِنہیں کیا نہیں تھا بخشا بہت

.....

اِن کے لیے آقا کی نویدیں بھی ہیں
دنیا بھی ہے، جنت کی سبیلیں بھی ہیں
اِک آیتِ قرآں کے بھی ہیں یہ مصداق
مداحی میں طلحہ کی حدیثیں بھی ہیں

.....

فردوسی بھی تھے طلحہ، زمینی بھی تھے
مکی مدنی بھی تھے، یہ قرشی بھی تھے
اصحابِ نبی میں تھے عجب شاں کے امیں
بالطورِ قبیلہ یہ تمیمی بھی تھے

.....

طلحہ بن عبید اللہ سے رغبت بھی ہے
رغبت ہی نہیں صرف، عقیدت بھی ہے
واللہ! محبت بھی ہے طلحہ سے ہمیں
اور یہ وہ محبت ہے جو سنّت بھی ہے

.....

اقوال و عمل اُن کے ہمیں ہیں انعام
طلحہ کے سے اسلام پہ ہو ہم کو دوام
کرتا ہوں تمام اِس پہ سخن میں، منظرؔ
ہے جنگِ جمل اُن کی شہادت کا مقام

منظر عارفی

درود و سلام

یہ احکم الحاکمین کا حکم ہے کہ
ان پر درود بھیجو
صلوٰۃ بھیجو
سلام بھیجو
اے مومنو،
صبح و شام بھیجو
بصد ادب احترام بھیجو
مُدام بھیجو

درود کیا ہے؟
مِرے خدا کا ہے یہ وظیفہ
جو، اَب ہماری زبان پر ہے
زمین پر ہی نہیں ہے یہ رحمتوں کی بارش
یہی عمل آسمان پر ہے
اِسی کی رحمت جہان پر ہے
درود کیا ہے؟
سلامِ رحمت
درود کیا ہے؟
خدا کی سُنّت
درود کیا ہے؟
نبی کی مِدحت
درود نبیوں کی ہے طریقت
وفا شعاروں کی یہ شریعت
ملائکہ کا یہ شغلِ احسن
درود، نذرانۂ عقیدت
درود کفّارہ معصیت کا
درود سامانِ خیر و برکت
درود سرچشمۂ بصیرت
درود، عرفاں، درود حکمت
درود قرآں، درود سُنّت
درود کیا ہے؟
حصار بھی ہے، پناہ بھی ہے
نجات کی ایک راہ بھی ہے
درود ہے دافعِ بلا بھی
درود ہے رافعِ وبا بھی
درود بخشش کا ہے وسیلہ
درود پَر، طائرِ دُعا کا
درود بے شک فلک رسا ہے
خدا کے محبوب کی ثنا ہے
محبتوں کا ہے قرض ہم پر
اے مومنو، ہے یہ فرض ہم پر
درود اِک فرض ہی نہیں ہے
یہ حق ہے، اور حق.....
نبیٔ برحق کا، سید المرسلین کا ہے
سلوک یہ سالکین کا ہے
یہ راستہ عارفین کا ہے
طریق روح الامین کا ہے
عمل یہ سب مرسلین کا ہے
نصاب، دنیا و دین کا ہے
شعار یہ عالمین کا ہے

یہ ورد ہے.....وردِ خاص ہے
جو کہ ارحم الراحمین کا ہے
یہی تو آتا ہے کام سب کو
یہی تو آئے گا کام سب کے
اے مومنو
بس یہ راہ چُن لو
سُنا ہے پہلے بھی، پھر یہ سُن لو
جو کام آئے، عمل یہی ہے
ہر ایک مشکل کا حل یہی ہے
درود کیا ہے؟
درود اِک نعت ہے جو میرے خُدا نے لکھی ہے
اور، اس کی کتاب میں ہے
نصاب میں ہے
یہ نعت شانِ پیمبرِ انقلاب میں ہے
قسم قلم کی
کہ یہ رسالت مآب کی عظمت و فضیلت کے باب میں ہے
کرن میں سورج، شجر ہے اِک بیج میں،
سمندر حباب میں ہے
پڑھو تو معلوم ہو کہ، اُمّی، مدینۃ العلم، اُم
الکتاب.....اُم الکتاب میں ہے
بس اِتنی سی بات ہی نہیں ہے
درود اِک نعت ہی نہیں ہے
درود اسرارِ معرفت کا ہے اِک خزینہ
تجلیوں سے اسی کی بن پایا طور سینا
یہی سمندر بھی، ناخدا بھی، یہی سفینہ
زمیں سے عرشِ بریں تلک ہے درود زینہ
درود کُنجی ء بابِ جنت، کلیدِ قفلِ درِ مدینہ
یہ نذر بھی ہے، نیاز بھی ہے
دُعا بھی ہے، یہ نماز بھی ہے
کرم بھی، احسان بھی، عطا بھی
درود اللہ کی دَیا بھی
درود رحمت بھی ہے، جزا بھی
درود نعمت بھی ہے، عطا بھی
یہ استغاثہ بھی، استدعا بھی
درود تسلیم بھی، رضا بھی
درود سرچشمہ ہُدیٰ بھی
مکاشفہ بھی، مراقبہ بھی
یہ تزکیہ بھی، مجاہدہ بھی
بنامِ خیرالانام ہر اُمتی کا ہے اِک مراسلہ بھی
یہ ہے خدا سے مکالمہ بھی
یہ بابِ رحمت پہ ایک دستک
یہ اہلِ دل کی پکار بھی ہے
یہ سحر، آسیب کا، نظر کا
ہر اِک بلا کا اُتار بھی ہے
درود کیا ہے؟
درود برکات کی ہے بارش
فضیلتوں کا حساب کیسا ؟
یہ تو شہء آخرت ہے، سوچو
تو صرف اجر و ثواب کیسا؟
گھٹن میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا
درود ظلمت میں روشنی ہے
یہ روشنی آنحضور کی ہے

درود برسات نور کی ہے
درود سے بخت جاگتا ہے
بے آسروں کا یہ آسرا ہے
کسی کا جادو چلے بھی کیسا؟
درود اِک موسوی عصا ہے
نجوم کی سب نحوستوں کا
درود سے خاتمہ ہوا ہے
درود پڑھ کر ہی مہر اپنا
ابوالبشر نے ادا کیا ہے
درود جو بھی نبی پہ بھیجے
خدا بھی خود اس پہ بھیجتا ہے
یہی ہے سچ اے وفا شعارو
خدا کے پیارو
درود سے عاقبت سنوارو
برس رہی ہے فلک سے شبنم۔
لو، چہرۂ زندگی سنوارو
نبیِ رحمت کی رحمتوں کو، چلو پکارو
عقیدتوں کے پیام بھیجو
بنامِ خیرالانام بھیجو
درود بھیجو، سلام بھیجو
درود اِتنا، ہیں جتنے آکاش پر ستارے
سمندروں میں ہیں جتنی موجیں، ہیں جتنے دھارے
درود اِتنا۔ زمین پر جتنے ہیں نظارے
درود اِتنا۔ گرے ہیں دھرتی پہ آج تک جتنے آب پارے
درود اِتنا۔ ہیں جتنے آباد لوگ دریاؤں کے کنارے
کُتب میں جتنے بھی ہیں زبر، پیش، الفاظ، جزم، شوشے

درود اتنا کہ اہلِ علم و ادب نے برتی ہیں
جتنی تشبیہیں استعارے
درود اتنا، دعائیں جتنی ہیں، جتنے بھی خواب ہیں ہمارے

نبیِ رحمت کی رحمتوں پر ہے جتنا بھی
انحصار، اتنا درود بھیجو
محبتوں کا یہ رشتہ ہو استوار، اتنا درود بھیجو
سکون مل جائے آئے دل کو قرار اتنا درود بھیجو
ہیں جتنے قدرت کے بھی مظاہر، ہیں جتنے
بھی شاہکار، اتنا درود بھیجو
کتابِ ہستی پہ ثبت جتنے بھی ہیں نقوش و نگار اتنا درود بھیجو
ہیں جتنے اشجار اور ان پر ہے جتنا بھی برگ و بار اتنا درود بھیجو
چمن میں بکھرے ہیں جتنے رنگِ بہار اتنا درود بھیجو
ہیں پھول جتنے قطار اندر قطار اتنا درود بھیجو
وہ جتنے بھی انبیاء کے ہیں تاج دار اتنا درود بھیجو
مرے نبی کے ہیں جتنے بھی پیروکار اتنا درود بھیجو
نبی کی اُمت نے بھیجے ہیں جتنی بھی دعاؤں
کے ساتھ اشکوں کے تار اتنا درود بھیجو
برس پڑے ٹوٹ کر ابھی رحمتِ کردگار اتنا درود بھیجو
تمام نبیوں نے، سب فرشتوں نے عاشقانِ رسول نے
جتنی بار بھیجے ہیں جو درودوں کے ہار اتنا درود بھیجو
جہاں بھی ہو جائے ختم گنتی شمار اتنا درود بھیجو
تمھارے بس میں ہے جتنا بھی اختیار اتنا درود بھیجو
خدا کو اپنے نبی سے ہے جتنا پیار اتنا درود بھیجو

سید عارف معین بلے

نعتیہ ماہیے

شار ترابی

اونٹوں کی قطار آئی
بادل درِ اقدس کا
برسا تو بہار آئی

ہر چاند ستارے سے
تاباں ہے بہت طیبہ
جگ سارے کے سارے سے

صحرا میں گھٹا پائیں
ہم خاکِ مدینہ کو
چومیں تو شفا پائیں

ماتھے محراب بنے
چُھو کر نعلین نبیؐ
ذرّے ماہتاب بنے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے قطرۂ خوں مصحفِ رخسار پہ تل بن
اے سطرِ تپاں! کاغذِ سادہ پہ دہک بھی

''ماہیے''

دیپک بنا جوتی ہے
جو آنکھ سے ٹپکا تھا
آنسو ہے کہ موتی ہے

راوی کا چڑھا پانی
مجھ سے نہ تکی جائے
اس شہر کی ویرانی

آکاش پہ تارے ہیں
دھرتی پہ جو بکھرے ہیں
وہ اشک ہمارے ہیں

اک شہرِ نگاراں ہے
وہ سانولی سی لڑکی
کس بات پہ نازاں ہے

کچھ پھول پرو لیتی
سینے سے ترے لگ کر
کچھ دیر تو رو لیتی

کونجوں کی اڑی ڈاری
ساجن تری بانہوں میں
جیون کی میں رت ہاری

سیما پیروز

''اے ارضِ زمستان'' ____ راجہ عبدالقیوم

مُدت بعد میرے سامنے ایک ایسی کتاب آئی ہے جسے میں صحیح معنوں میں ایک ادبی تصنیف کہہ سکتا ہوں ، راجہ عبدالقیوم صاحب کی یہ کتاب رُوس اور بیلا رُوس کے بارے میں ہے۔ رُوس کے بارے میں کچھ اور ادیبوں نے بھی سفرنامے لکھے ہیں مگر یہ چیزے دیگر ہے۔ ایک تو اسے معروف معنوں میں سفرنامہ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ مصنف کے ساڑھے پانچ سالہ قیام رُوس کی سرگزشت ہے۔ اُردو کے قاری کو جس طرح یہ کتاب رُوس کے شاعروں، ادیبوں اور مجموعی طور پر وہاں کی ادبی ثقافتی اور سماجی فضا اور ماحول سے متعارف کراتی ہے اس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ نے راجہ عبدالقیوم کو نہ صرف شعر و ادب کا عمدہ ذوق ارزانی کیا ہے بلکہ انہیں اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں سے بھی نوازا ہے۔ جس ذوق وشوق اور گہری نظر سے انہوں نے وہاں کی ادبی ثقافتی اور سماجی زندگی کا مشاہدہ اور تجزیہ کیا ہے وہ ایک عام سیاح یا سفرنامہ نگار نہیں کرسکتا سفرنامہ نگار تو اکثر زیادہ تر خود اپنے بارے میں ہی لکھتے رہتے ہیں۔

راجہ عبدالقیوم جون 2010 سے جنوری 2016 تک پریس کونسلر کی حیثیت سے پاکستان سفارت خانہ ماسکو میں تعینات رہے ہیں۔ اس دوران انہوں نے اپنی دلچسپی اور ذوق کے مطابق اپنے قیام کا خوب خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ میں بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ آج تک کسی پاکستانی سفارت خانے کے کسی اہلکار نے کسی ملک کے ادبی اور ثقافتی ماحول اور فضا کے بارے میں اس طرح کی کوئی دستاویز اپنے ہم وطنوں کو نہیں دی۔ خاص کر رُوس کے بارے میں تو ہمیں اس طرح کی دستاویز کی ضرورت تھی کیونکہ اس موضوع پر ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ ہمیں تو پروفیسر فتح محمد ملک صاحب کی تحریروں سے کسی حد تک معلوم ہوا ہے اور جیسا کہ انہوں نے اس کتاب کے تعارف (راجہ عبدالقیوم اور ارضِ زمستان) میں بھی فرمایا ہے کہ ''جب برصغیر کے اشتراکی دانشوروں نے اقبال کے خلاف شدید ردِعمل برپا کر رکھا تھا، عین اُس وقت رُوس میں اقبال شناسی کی روایت

جمیل یوسف

پروان چڑھ رہی تھی.....''

''پاکستان کے عہد آفرین شاعر فیض احمد فیض پر جتنا کام رُوسی دانش وروں نے کیا وہ اپنی مال آپ ہے۔ روس کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ فیض کی شاعری پر تین زبانوں میں چھپنے والی پہلی کتاب ''قندیل فیض ماسکو ہی سے شائع ہوئی تھی اور فیض کی فلم ''دور ہے سکھ کا گاؤں'' پاکستان میں تو نہ دکھائی جا سکی تھی مگر ماسکو میں بڑے اہتمام سے دکھائی گئی تھی۔

''محترمہ لدمیلا ویسلیوا کی فیض شناسی کی تحسین میں راجہ عبدالقیوم کا یہ کہنا برحق ہے کہ فیض کے پرستاروں میں اور ناقدین میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے اس کے کلام کا اس عمیق نظر سے تجزیہ کیا ہو۔ محترمہ کے علم، جستجو اور تحقیق کا مُرقع ان کی کتاب ''فیض پرورشِ لوح و قلم، حیات اور تخلیقات'' دُنیا بھر کے اُردو بولنے اور سمجھنے والوں سے دادِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔''

پروفیسر فتح محمد ملک صاحب کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''راجہ عبدالقیوم نے روس اور بیلا روس میں اپنے قیام کے دوران رُوس اور بیلا رُوس کی تاریخ وتہذیب کی عکاسی کچھ اس شان سے کی ہے کہ ان کے ان خطہ ہائے زمین کی تاریخ و ثقافت میں پاکستان کی تاریخ وثقافت کے گم شدہ عکس بھی لرزاں ہیں۔

راجہ عبدالقیوم محترمہ لدھیلا ویسلیوا کے بارے میں لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''آداب عرض ہے'' ماسکو میں آواز سُننا اچنبھے کی بات تھی۔ مجھے یہاں آئے ہوئے ابھی ایک ہی دن ہوا تھا اور صدیوں کی اجنبیت نے مجھے اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔ سفارت خانے کی ایک تقریب میں ایک معمر روسی خاتون کے لبوں سے انتہائی شستہ انداز میں ادا کیے گئے۔ یہ الفاظ سُنے تو دل باغ باغ ہوگیا لیکن حیرتوں کے بھی بیسیوں باب وا ہو گئے۔''

یہ اقبال شناس اور فیض کی پرستار وہی خاتون تھیں جن کا ذکر اُوپر پروفیسر فتح محمد ملک کے پیش لفظ کے ضمن میں آیا ہے۔ راجہ صاحب نے اُن کی سخن شناسی کے بارے میں اُن کی تحریروں کا حوالہ دے کر حیران کر دیا ہے۔

''میں نے مادام کا اقبال کی نظم ہمالیہ پر لکھا گیا مضمون پڑھا۔ اقبال کے پہلے مجموعۂ کلام بانگِ درا کی پہلی نظم کے صرف تین بندوں کے تجزیے پر جتنی اس مضمون میں محترمہ لدمیلا نے فکرِ اقبال، لفظیاتِ اقبال ان کے اندازِ بیان، تاریخ اور عمرانیات پر ان کی گہری نظر اور جملہ امکانات کی نشان دہی جو ان کی بعد کی شاعری میں ظاہر ہونا تھا، کے بارے میں اتنا کچھ کہہ دیا ہے جو اور بہت سے اعلیٰ پائے کے اقبال شناس شاید کئی کتابوں میں بھی اسی سلیقے سے نہ سمیٹ سکیں۔

اسی طرح فیض کی نظم ''تنہائی'' کا ان کے سارے کلام اور ان کی جذباتی فکری اُپج سے تعلق کا جس ماہرانہ چابک دستی سے محترمہ نے تجزیہ کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ فیض نے تنہائی کے ذاتی

تجربے کو جس طرح حسی اور جذباتی تشبیہات اور استعارات کے تخلیقی اور جمالیاتی استعمال کے ذریعے ایک کائناتی تنہائی میں تبدیل کر دیا ہے اسے محترمہ نے ایک مختصر مضمون میں کھول کر بیان کر دیا ہے اس کی ساری جہتیں کھل کر سامنے آ گئی ہیں۔ اور تہ در تہ تنہائی کے پرت کھلتے جاتے ہیں۔ آنکھوں کے بے خواب کواڑوں کا رشتہ محبوب کی آمد کے انتظار میں ستاروں کے ٹمٹمانے اور پلکوں کے جھپکنے سے جا ملتا ہے۔ یوں فیض کی تنہائی ایک آفاقی تنہائی بن جاتی ہے اور اس کے سارے کلام کی رگ و پے میں سرایت کر کے اسے لفظیاتی فکری اور جمالیاتی تاثر اور تسلسل سے ہمکنار کرتی ہے۔

فیض کے پرستاروں اور ناقدین میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے اس کے کلام کا اس قدر عمیق نظر سے تجزیہ کیا ہو۔"

میں نے راجہ عبدالقیوم صاحب کے مضمون سے یہ اقتباس اس لئے بھی دیا ہے کہ قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ زیر نظر کتاب کے فاضل مصنف نے کس گہرائی میں جا کر اپنے موضوع پر بات کی ہے۔

پشکن کے بارے میں لکھا ہے: "روس میں جہاں جائیے۔ آپ کو پشکن سے پالا پڑتا ہے۔ گلی، کوچے، چوک بازار، میوزیم بلکہ عام عمارتیں، لائبریریاں، الغرض ہر دوسری تیسری ساکن چیز پشکن کے نام سے موسوم ہے۔ پشکن کہیں تصویر کہیں مجسمے اور کہیں تحریر کی صورت میں موجود ہے۔ یہاں تک کہ روس میں قیام کے دوران کافی عرصے تک مجھے یہی لگتا تھا کہ پشکن کوئی زندہ شخص ہے اور کہیں نہ کہیں بنفسِ نفیس میری اس سے ملاقات ہو جائے گی۔"

اسی انداز میں لکھے گئے اس کتاب میں 27 باب ہیں کسی میں کسی روسی ادیب یا شاعر کا ذکر ہے۔ یا روس اور بیلا روس کی ثقافتی اور سماجی زندگی کے کسی پہلو کا یا روس کے تناظر میں پاکستان کے حوالے سے کوئی دلچسپ اور معلومات افزا بات ہے۔ یہ سارے مضامین اتنے دلچسپ اور پڑھے جانے کے قابل ہیں کہ ممتاز شاعر اور ادیب جناب نسیم سحر کتاب میں شامل اپنے مضمون "راجہ عبدالقیوم کی 'اے ارضِ زمستان' پر ایک نظر" میں لکھتے ہیں: "آپ ان مضامین کی ادبی چاشنی، دلچسپی اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ میں وقتاً فوقتاً یہ تمام مضامین مختلف ادبی جرائد میں پہلے بھی پڑھ چکا ہوں مگر اب یک جا ہو کر کتاب کی صورت میں ملے تو انہیں نہ صرف قند مکرر کے طور پر پڑھ کر ایک انوکھی نشاطیہ کیفیت سے ہمکنار ہوں بلکہ یہ مصرع بھی یاد آیا ہے۔ "جب بھی دیکھا ہے مجھے عالمِ نو دیکھا ہے۔"

میں سمجھتا ہوں نسیم سحر صاحب کا یہ بے ساختہ تبصرہ کسی بھی اہل قلم کے لئے قابل رشک کیفیت کا حامل ہے۔ میں جناب راجہ عبدالقیوم صاحب کو اس ناقابل فراموش تصنیف کی اشاعت پر مبارک باد دیتا ہوں اور دعا گو ہوں۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

☆☆☆☆☆

کعبے کے متولی

سیّدنا اسماعیلؑ کے سسرالی وادی بکہ میں ٹھہرے تو اس لیے تھے کہ اس آب و گیاہ بنجر مٹی اور نوکیلے پتھروں کی پہاڑیوں کے بیچ سر راہ انہیں میٹھے خوشگوار پانی کا چشمہ آب زم زم نظر آ گیا تھا۔ سیّدنا اسماعیلؑ کی والدہ سیّدہ ہاجرہؑ نے بھی گزرتے قافلے کو اس پانی سے فیض یاب ہونے کی اجازت دے دی۔

وہ ٹھہر گئے۔

انھوں نے اپنے جھونپڑے بنا لئے۔ یمن کے یہ لوگ قبیلہ جرہم سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی وادی میں پھر سیّدہ ہاجرہؑ کی وفات ہو گئی۔ اس وقت ان کا بیٹا سیّدنا اسماعیلؑ ۲۳ برس کا تھا۔ دس سال اور گزرے تو سیّدنا ابراھیمؑ پھر وہاں تشریف لائے۔ خدا نے اپنا گھر دونوں باپ بیٹا سے بنوایا۔

وہ لوگوں کو خدا کے اس مقدس گھر کے سفر کے لیے بلاتے۔ کہتے آؤ اس کا حج کرو۔ طواف کرو۔ عمرہ کرو۔

خود وہ اپنی اولاد کے ساتھ آنے والوں کی مہمان نوازی کرتے اور خدا کے گھر کو صاف ستھرا رکھتے۔ دُور دراز سے دُبلی پتلی تھکی ہوئی اونٹنیوں پہ اس گھر کی عبادت کے لیے آنے والوں کو کھلانا پلانا، مہمان نوازی کرنا سیّدنا اسماعیلؑ کی ہی ذمہ داری تھی۔ قریب ہی وادی میں ٹھہرے ہوئے بنو جرہم کے سردار مضاض بن عمرو جرہمی کی خُوبرو لڑکی ''رعلہ'' سے سیّدنا اسماعیلؑ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اسی شادی سے ان کے بارہ لڑکے اور ایک لڑکی کی ولادت ہوئی۔ وہ جو کل تک بے سر و سامان کمزور، نحیف ایڑھیاں رگڑتے ہوئے شیر خوار اس وادی بکہ میں لائے گئے تھے اب ایک مضبوط قبیلے کے سربراہ تھے۔ بڑا بیٹا 'نابت' تھا۔ دوسرا 'قیدار'۔ کچھ اُسے قیدر بھی کہتے تھے۔ قیدار بن اسماعیلؑ سے آقا کا سلسلہ نسب ہے۔ پھر تیسرا 'اذیل'، چوتھا 'منشا'، پانچواں 'سمع'، چھٹا 'ماشی'، ساتواں 'ونا'، آٹھواں 'اذر'، نوواں 'نظیما'، دسواں 'نطورا'، گیارہواں

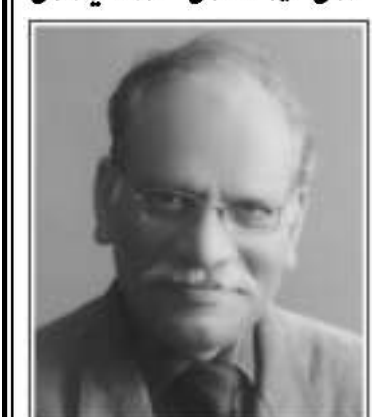

ابدال بیلا

'نیش' اور بارھواں 'قیذما'۔
بیٹی ایک ہی تھی 'نسمہ'۔ یہ شاید سیّدنا ابراہیمؑ کا حکم تھا یا دونوں بھائیوں اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کی خواہش کہ سیّدنا اسماعیلؑ کی اس بیٹی کو بیاہنے کے لئے سیّدنا اسحاقؑ فلسطین سے اپنے بیٹے عیصو کو اس وادی میں لے کر آئے۔ نسمہ اور عیصو کی شادی ہوگئی۔ عیصو نسمہ کو لے کر اپنے کنبے کے پاس فلسطین لے گیا۔ اس جوڑے کی اولاد سے فلسطین میں 'روم'، 'فارس' اور اشبان نام کے بچے پیدا ہوئے۔
بچے تو اسماعیلؑ کے بچوں کے بھی بہت ہوئے۔ تھوڑے ہی برسوں میں وادی بکہ میں سیّدنا اسماعیلؑ کی اولاد پھیل گئی۔ ان سب بیٹوں نے عموماً شادیاں پاس رُکے ہوئے اپنے ابا سیّدنا اسماعیلؑ کے سسرالی قبیلے بنو جرہم کی لڑکیوں سے کیں۔ بنو جرہم عرب کے جنوبی سرسبز خوشحال علاقے یمن سے سیل عرم کے ٹوٹنے کے بعد عرب کے علاقوں میں مارے مارے پھرتے تھے۔
بنو جرہم کو مکہ راس آ گیا۔ خدا کا گھر ادھر تھا۔ دُور دُور سے لوگ اس گھر کی زیارت کے لیے اونٹنیوں پہ چڑھ کے آتے تھے۔ پھر اس جگہ سے کئی طرف راستے جاتے تھے۔ تجارتی سفر کی بھی وہ راہ تھی۔ دھیرے دھیرے یمن سے آئی بنو جرہم کی آبادی اولاد اسماعیلؑ سے زیادہ ہوگئی۔ اولاد اسماعیلؑ سے رشتہ داری کی وجہ سے بھی وہ انہیں اپنا ہی قبیلہ سمجھنے لگے۔ بنو جرہم کے سارے ماموں، بنو اسماعیل کو داماد سمجھے بیٹھے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں بنو جرہم نے کعبے کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اب وہ جسے چاہتے انہیں کعبہ کی زیارت کرنے دیتے۔ آنے والوں پہ ٹیکس لگا دیتے۔ ان کا کاروبار سنور گیا پیسوں کی فراوانی ہوگئی۔ اونٹوں، بکریوں کے ریوڑ زیادہ ہوگئے۔ پھر آتے جاتے تجارتی مال اسباب پہ چونگی انہیں علیحدہ ملتی۔
ان لوگوں کی ہیئت بدل گئی۔
گردنیں تن گئیں۔
کندھے چوڑے ہوگئے۔
پیٹ بھاری ہوگئے۔
ایسی کیفیت میں شاید ہی کوئی سوچتا ہو کہ اگر یہ نعمت ہے بھی تو ملی کیسے۔
الٹا جس کی طرف سے یہ احتمال ہوتا ہے کہ یہ سارا احسان اس وجہ سے ہوا ہے، بندہ اپنی فطری احسان فراموشی کے وجہ سے اس محسن سے دُور ہو جاتا ہے۔ پہلے اولاد اسماعیلؑ سے دُور ہوئے۔ پھر ان کے بنائے خدائے مقدس کے گھر کے تو چوہدری بنے رہے۔ خدا سے بیگانے ہوگئے۔ کعبہ ضرور وہاں تھا، مگر وہ ان لوگوں کے لیے پیسہ کمانے کی دکان بن گیا۔ کعبہ کے گرداگرد ان لوگوں نے اپنے گھر بنا لیے۔ کعبے سے چالیس گز دُور زم زم کا کنواں تھا۔ وہیں ان کے قبیلے کے ایک مرد اساف بن

لیلیٰ جرہمی اور وادی کے باہر سے آئی ہوئی کسی لڑکی نائلہ بنت وائل نے زم زم کے کنارے پانی پیتے پلاتے بدکاری کر دی۔ کہتے ہیں اس گناہ کی پاداش میں نائلہ اور اساف دونوں کے جسم پتھر کے بن گئے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ لوگ ان پتھروں پر جا کر کنکریاں مارتے۔ رمی کرتے۔ ہوا اُلٹ۔ جرہموں نے جا کر اُن پتھروں پہ چڑھاوے چڑھانا شروع کر دیئے۔ جیسے انھوں نے کوئی بہت بڑا پن کیا ہو، کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہو۔

کوئی پھل لے آتا۔ کوئی اپنا جانور لا کے وہیں ان دونوں پتھروں کے بیچ چھری لے کر اسے ذبح کرتا۔ باہر سے آنے والے زائرین کے لیے بھی یہ طرفہ تماشہ تھا۔ وہ بھی یہی کرتے جو یہاں کیا جاتا۔ الٹا ان بدکردار پتھروں کی مزید عزت افزائی کے لیے انھوں نے نائلہ کو حرم کے اندر ہی خانہ خدا سے کوئی سو گز کے فاصلے پہ صفا پہاڑ پہ جا رکھا کہ دُور سے نظر آئے۔ اساف کو اٹھا کے صفا سے دو سو چار گز دور مروہ کی چوٹی پہ جا سجایا۔ اور ان دونوں کی پوجا پاٹ ہونے لگی۔ سال ہا سال یہ سلسلہ چلتا رہا۔

بنو خزاعہ والے بھی سیل عرم کے پیش نظر یمن سے سکونت ترک کر کے اِدھر آئے بیٹھے تھے۔ مکہ کی وادی کے اندر تو بنو جرہم اور اہل اسماعیل تھے۔ اسی لیے بنو خزاعہ مکہ کی پہاڑیوں کی دہلیز مراظہران میں آ بیٹھے۔ ہٹ کے دُور بیٹھنے کی وجہ سے بھی ان کے گروہ کا نام خزاعہ پڑ گیا۔ ورنہ تھے وہ بھی یمن بنو قضاعہ سے۔

امکان ہے کہ مراظہران کی طرف سے جو زائرین مکہ کے لیے آتے تو بنو جرہم کی دیکھا دیکھی بنو خزاعہ والے بھی ان سے ٹیکس وصول کرتے۔ ایک تو زائرین پہ بار پڑ گیا۔ دوسرا بنو جرہم والے سیخ پا ہو گئے۔

بھئی تم کون ہو۔

ہٹو۔

جاؤ۔

بات چیت ہاتھم پائی تک جا پہنچی۔

پھر باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی۔

بنو جرہم والے تعداد میں کم تھے اور بنو خزاعہ زیادہ۔ رہ گئی اولاد اسماعیل، وہ خاموش رہے۔ دُوسرا یوں بھی تھا کہ بنو خزاعہ مکے کے باہر، مضاف میں ہونے کی وجہ سے اندر رُکے بنو جرہم والوں کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ کئی دنوں تک لڑائی ہوتی رہی۔ آخر بنو جرہم کو یقین ہو گیا کہ انہیں گھیر لیا گیا ہے، بچنا ہے تو نکلنا پڑے گا۔ ورنہ سارے مار دیے جائیں گے۔

جاتے جاتے انہیں ایک بدطینتی بھری شرارت سوجھی۔

شاید انہیں یہ بھی خیال ہو کہ یہ وقتی معاملہ ہے۔ کچھ دنوں بعد وہ واپس پلٹ آئیں گے اس لیے اپنا قیمتی سامان کہیں چھپا جائیں۔ قیمت تو اس سارے علاقے کی صرف خانہ خدا سے تھی۔ کعبہ پہ چڑھاوے

چڑھتے تھے۔ کسی چڑھاوے کی کوئی آخری حد تو تھی نہیں۔ کئی قیمتی تلواریں، سونے کے بنے ہوئے دو ہرن اور بہت سا چاندی سونے کا سامان وہ کہاں بھاگے بھاگے ساتھ لیے پھرتے۔

انھوں نے سوچا یہ سارا سامان یہاں کہیں کسی ایسی جگہ چھپائیں کہ کسی کی نگہ نہ پڑے۔ جب پھر واپسی کی راہ ملے تو آ کر نکال لیں گے۔ یہ سوچتے سوچتے نجانے انہیں کیوں اساف اور نائلہ کے بتوں کی پرانی جگہ اور کعبہ سے کوئی چالیس گز کے فاصلے پر زم زم کا کنواں نظر آیا۔ شاید انھوں نے سوچا ہو جاتے جاتے بنوخزاعہ کو سزا دینی چاہیے تو وادی کا میٹھا مقدس پانی بھی بند کرتے جائیں۔ ساری قیمتی چیزیں انھوں نے زم زم کنوئیں میں ڈال دیں، اوپر سے پتھر اور مٹی ڈال ڈال کے سارا کنواں ہی بند کر دیا۔ یہ کام یقیناً انھوں نے کسی تاریک رات میں کیا ہوگا۔ خاص طور پر جب دونوں فریقوں میں کعبہ کے گرداگرد بستیوں میں لڑائی ہو رہی تھی۔

لڑائی میں دونوں طرف ہم نام سردار لڑ رہے تھے۔ بنوجرہم کی طرف سے ان کے سردار عمرو بن حارث جرہمی تھے۔

دوسری طرف سے عمرو بن عامر خزاعی تھے۔

بہت دن لڑائی جاری رہی۔ بڑا خون خرابہ ہوا۔ آخر فیصلہ ہو گیا۔

بنوجرہم نکل جائے۔

لڑائی ختم ہو گئی۔

بنوجرہم نے ہار مان لی۔ اور چلے گئے۔

بنوخزاعہ جیت گئے۔ وہ مکہ کے مضاف مراظہران سے اتر کے مکے کے اندر آ گئے۔ مکہ کے متولی بن گئے۔ انھیں اپنی جیت پہ اتنا غرور تھا کہ سال ہا سال تک انہیں خیال بھی نہ آیا کہ خانہ کعبہ سے چالیس قدم پہ جو زم زم کا کنواں ہوا کرتا تھا وہ کہاں گیا۔ ویسے بھی مضاف میں رہنے کی وجہ سے وہ اندر کی تفصیلات سے زیادہ آگاہ نہیں تھے۔ بستی میں اِکا دُکا اور کنواں بھی بن گیا تھا۔ زم زم کی انھوں نے پرواہ نہ کی۔ الٹا وہ اس جگہ سے اٹھوائے ہوئے صفا اور مروہ پہاڑیوں پہ رکھے بدکار اساف اور نائلہ کے بتوں کو واپس اسی جگہ پہ لے آئے۔ خوب تیل گھی سے چمکایا، پھر ان پتھروں کو نذرانے چڑھائے اور وصول کیے۔

ہارے ہوئے بنو جرہم کے لوگ اپنے اونٹوں پہ سوار ہو کے اس وادی سے نکل گئے۔ وہ لوگ غمگین تھے۔ اُداس اشعار پڑھتے جا رہے تھے جوان کے سردار عمرو بن حارث کے کہے ہوئے تھے۔

''بہت سے قبائل کہنے والے ہیں۔

اس حال میں آنسو لگاتار بہے جا رہے ہیں۔

آنکھیں خالی خالی اور ویران ہو گئی ہیں۔

حجون سے صفا تک کوئی بھی ایسا شخص نہ ملا جس نے حوصلہ دیا ہو اور کالی رات میں قریب آ کے حوصلے کی بات کی ہو

میرا دل ڈوب گیا جیسے پرندے کے دو پروں کے درمیان
پھڑ پھڑاتا ہے اُداسی سے۔
ایسا کیوں نہ ہو
ہم اس وادی کے باشندے تھے۔
حادثوں نے ہمیں جدا کر دیا۔
جلاوطن کر دیا۔
نابت کے بعد ہم متولی ہوئے تھے۔
ہم اس گھر کا طواف کرتے تھے۔
خیر و برکت وہاں نمایاں تھی۔
اس گھر نے ہمیں معزز بنایا تھا۔ حکمرانی ملی تھی ہمیں
عظمت و افتخار ملا تھا۔
یہ ہم ہی تھے جس نے بہترین شخص نابت بن اسماعیلؑ کو اپنی بیٹی کا نکاح دیا تھا۔
ان کی اولاد ہمارے بچے ہیں۔
اگر زمانے کی ہوا ہمارے خلاف چلی ہے تو ہمیں کیا۔
یہ دنیا ہے، یہاں ایسا ہوتا آیا ہے۔
ہمیں کوئی خدا کے گھر کے قرب سے دور نہیں کر سکتا۔
لگتا ہے اس گھر والے خدا کو ہمارا قریب رہنا بُرا لگا۔
ہم سے کوئی غلطی ہوگئی ہوگی۔
شاید ہم سو گئے۔
ہم کہانی بن گئے
کبھی کو ہم قابل رشک تھے۔
اس متبرک شہر کے لیے آنکھیں رو رہی ہیں۔
آنسو گر رہے ہیں۔
وہاں اللہ کے شعائر ہیں، امن ہے۔
اس گھر کے کبوتر کو بھی کوئی نہیں چھیڑتا۔
پھر بھی ہمارے بال و پر کھینچ کے ہمیں نکال دیا گیا، وہاں سے۔
کیسے بدنصیب ہیں ہم
اے لوگو!
خدا کے گھر کی طرف جاتے مسافرو تیز قدم اٹھاؤ، سواریوں کی مہاریں ڈھیلی کرو۔
پہنچ جاؤ اس متبرک جگہ جہاں ہر کوئی موت سے پہلے پہنچنا چاہتا ہے۔
ہماری طرف نہ دیکھو۔
ہم وہ لوگ ہیں جن کے بخت نصیبوں سے گر گئے۔
کبھی ہم بھی تمہاری طرح تھے۔
اپنے گھروں کو جانے والے۔
متبرک گھر کے پڑوس میں رہنے والے"۔
کہا جاتا ہے بنو جرہم کے یہ کہے ہوئے دکھ بھرے بول عربی زبان کے پہلے پہل کے اشعار ہیں جو انھوں نے خدا کے گھر سے دور جاتے ہوئے روتے روتے کہے۔ ان کے جاتے ہی وادی مکہ میں خزاعہ قبیلہ کا عمرو بن عامر، رئیس مکہ ہو گیا۔ کہنے کو اس قبیلے نے ساڑھے چار سو سال تک مکہ میں حکمرانی کی۔ آخر جس کا حق تھا حق اُسے مل کر رہا۔ مگر اس عرصے میں مکہ کی وادی میں عجیب واقعات رونما ہو گئے۔
کئی سو سال خانہ کعبہ کی چار دیواری کے

اندر بت نہیں آئے۔ صحن میں ضرور اساف اور نائلہ کے ان گھڑے بت پڑے رہے۔ جرہمیوں نے کچھ عرصہ انہیں صفا اور مروہ پہ بھی رکھا۔ خزاعہ والے پھر ان بدکاروں کے نشان کو گم شدہ آب زم زم کے کنویں کے پاس خانہ خدا کے سامنے چالیس گز کے فاصلے پہ لے آئے۔

پھر ایک بدبخت آدمی آ گیا۔

بنو خزاعہ کے قبیلے کا رئیس بن کے۔

وہ عمرو بن لحی تھا۔

ہوا یوں کہ وہ بہت امیر ہو گیا تھا۔ بیس ہزار اونٹوں کا مالک تھا۔ ہر ایک ہزار اونٹوں کے بعد ایک اونٹ کی آنکھ پھوڑ دیا کرتا تھا تاکہ نظر بد سے اس کے باقی اونٹ بچے رہیں۔ یوں اس کی ملکیت میں بیس کانے ایک آنکھ والے اونٹ پھرا کرتے تھے۔ حج کے دن آتے تو وہ دس ہزار اونٹوں کی قربانی کرتا۔ دس ہزار کپڑوں کے جوڑے حاجیوں کو پہناتا۔ گھی شہد اور شکر پلاتا۔ ریاست، عظمت، سرمایہ اور ذاتی زور بازو کے باعث وہ اپنی قوم کا سورما تھا۔ دُور دراز کے علاقوں میں بڑے لمبے تجارتی قافلے لے کر سفر کیا کرتا تھا۔ ایسا ہی ایک بدنصیب سفر تھا جب وہ ایک دفعہ مکہ سے شام کے علاقے بلقاء میں جا ٹھہرا۔

وہاں عمالقہ کی حکومت تھی۔

وہ لوگ بت پوجنے والے تھے۔ یہ اس کے شہر اور بستیوں میں گھومتا پھرتا ان کے کسی مندر میں جا پہنچا۔ رنگا رنگ کے لکڑی، پتھر اور دھات کے سجے سجائے بت ایستادہ ہیں اور مقامی لوگ ہاتھ جوڑے ان سے اپنے دلوں کی خواہشوں کی فریاد کر رہے ہیں۔ کوئی اولاد کے لیے منتیں کر رہا ہے۔ کوئی مال و جواہر کے لیے تڑپ رہا ہے اور کوئی بتوں سے بارش طلب کر رہا ہے۔ عمرو بن لحی کے ساتھ اس کے میزبان ساتھی تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کے بڑا حیران ہوا۔ پوچھنے لگا یہ مٹی، پتھر اور لکڑی کی بنائی ہوئی چیزیں کیا ہیں جن سے تمہارے لوگ فریاد کر رہے ہیں؟

وہ بولے، ہم نے اپنے خدا بنائے ہیں۔

اپنے خدا تم خود بناتے ہو؟

ہاں۔

کیوں؟

ان سے جو مانگا جاتا ہے، وہ دیدے دیتے ہیں۔

مجھے بھی دیں گے؟

اپنے کچھ خدا

کچھ بت

وہ لالچی، کم عقل اور کوتاہ اندیش تھا۔ اُسے اندازہ ہی نہ ہوا کہ جس چیز سے یہ لوگ مانگنے بیٹھے ہیں، وہ ان انسانوں سے کم تر اور حقیر ہیں۔ کیسے ان کی دعاؤں کو قبولیت دے سکتے ہیں۔ الٹا خود انہیں دیکھ، انہیں کی طرح ہاتھ پھیلا کے اُن کے بتوں کے آگے بیٹھ گیا۔

☆☆☆☆☆

اور محبت کیا دیتی ہے

پروین کی کتاب شب رفتہ پر بہتر تبصرہ تو کوئی نقاد ہی کر سکتا ہے میں عام قاری اور پروین کی دوست ہونے کے ناطے تھوڑی سی بات کروں گی۔

انسانی حیات کے ساتھ ہی کہانی کا وجود ظہور پزیر ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جس درخت کا پھل کھانے سے آدم کو منع کیا تھا۔ اماں حوّا نے شیطان کے ورغلانے پر بابا آدم کو کوئی دلپذیر کہانی ہی سنائی ہو گی، جس کی وجہ سے آدم کو قائل ہونا پڑا۔ سو کہانی ازل سے انسان کے ساتھ ہے۔ پروین نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ ایک طرح سے علمی ادبی تھا۔ والد اس زمانے کے ڈبل ایم تھے۔ جب مسلمان خال خال ہی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ وہ سری نگر ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ انھیں شعر و شاعری اور ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ خود بھی شعر کہتے تھے۔ لیکن اپنی شاعری نہ کبھی کسی کو دکھائی اور نہ سنائی۔ کیونکہ اس زمانے میں عشقیہ شعر کہنا یا ہجر و وصال کے مضمون باندھنا شریف اور باکردار شخص کو زیب نہیں دیتا تھا۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ پروین اپنے جینز میں ادب لے کر پیدا ہوئی۔ بڑی ہوئی تو بھائی احمد بشیر کا اوڑھنا بچھونا ہی ادب تھا۔ اس زمانے کے مشہور شاعر اور ادیب ان کے ہاں آتے تھے۔ پروین کی سب سے زیادہ دوستی ممتاز مفتی سے تھی۔ اس ماحول نے پروین کے ادبی رجحان کو جلا بخشی۔ موزوں علمی ادبی ماحول سے پروین کے فن کی کھیتی خوب پھلی پھولی اور ہمیں کیسے کیسے شاہکار افسانے پڑھنے کو ملے۔ اس سے پہلے ہم جس پروین کو جانتے تھے۔ وہ منجھی ہوئی افسانہ نگار اور خوبصورت سفرنامہ نگار کے طور پر پہچانی جاتی تھی۔ شب رفتہ پروین کا پہلا ناول ہے۔

اس ناول میں کچھ ہڈ بیتی ہے اور کچھ جگ بیتی ہے۔ ہم جو کچھ لکھتے ہیں۔ کسی نہ کسی حوالے سے ہماری ذات کا پرتو ہوتا ہے۔ کیونکہ میں کو نکال کر کوئی کہانی نہیں لکھی جا سکتی۔ کسی بھی دردمند اور حساس دل

سیما پیروز

رکھنے والے لکھاری کی کہانیوں میں خارجی اور اندرونی عوامل ہمیشہ شامل ہوتے ہیں۔
پروین کے کردار جاندار اور جیتے جاگتے ہیں۔ چاہے وہ عکسی ہو۔ ثروت ہو یا تحصیلدار نانا ہوں۔ لیکن سب سے مضبوط کردار تارا کا ہے۔ شب رفتہ میں ہر کردار اپنی جگہ ایک اکائی ہے لیکن سب کردار مربوط ہیں۔ اگر کسی ایک کردار کو بھی نکال دیں تو باقی بے جان ہو کر رہ جائیں گے۔
پروین نے کرداروں کے اندرونی کرب، غم و اندوہ اور خوشی و شادی کے لمحات کی بڑی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ ناول کی ہیروئن تارا کے سارے حالات، واقعات اور سانحات کو پروین نے پہلے اپنے باطن میں اتارا ہے اور پھر انھیں لفظوں کے سانچے میں ڈھال کر اپنے ناول شب رفتہ میں پیش کیا ہے۔
ناول میں اس زمانے کے تاریخی اور جغرافیائی حالات بڑی عمدگی اور باریک بینی سے بیان کیے ہیں۔ پروین قاری کو شروع سے آخر تک اپنے ساتھ لے کر چلی ہے۔ قاری کو کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ وہاں موجود نہیں ہے۔
پروین کا طرز تحریر، انداز اور لب و لہجہ کسی کا چربہ نہیں بل کہ خالصتاً اس کا اپنا ہے۔ ان کی تحریر میں سادگی سلاست اور بے ساختہ پن ہے۔ شب رفتہ پڑھتے ہوئے کہیں بھی بوریت اور بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا۔ ناول ذرا سنجیدہ موڈ میں ہے۔ لیکن کہیں کہیں پروین نے کسی واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ بے اختیار مسکراہٹ چہرے پر آجاتی ہے۔ جیسے ایمن آباد کا سٹیشن جہاں گاڑی بہت کم وقت کے لیے رکتی تھی اور کس طرح سامان اور بچے گٹھڑیوں کی طرح لڑھکائے جاتے تھے۔ میں نے اس منظر کو بہت انجوائے کیا کیونکہ اس سے ملتی جلتی صورت حال سے میں بھی دو اڑھائی سال دوچار رہی ہوں۔
لاہور سے لیاقت پور جاتے ہوئے ہم بھی بالکل اسی طرح سامان اور بچے باقاعدہ پلیٹ فارم پر لڑھکاتے تھے۔ آخر میں بچے لڑھکانے والے کو تقریباً چلتی گاڑی سے چھلانگ لگانی پڑتی تھی۔
پروین نے شب رفتہ میں اس زمانے کا کلچر اور سفاک حقیقتیں بڑی ایمانداری اور سچائی سے بیان کی ہیں۔ جیسے تارا کے نانا کا کردار۔ وہ اپنی بیویوں کو پیٹتے تھے۔ کیونکہ اس زمانے میں بیویوں کو مارنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ عورت پاؤں کی جوتی تھی تو جوتی کو سر پر کون بٹھاتا۔
نانا ہر طرح سے بیویوں میں برابری کا سلوک روا رکھتے تھے۔ ایک بیوی کو کسی قصور پر مار پڑتی تو دوسری کو بھی بغیر وجہ کے دو چار ڈنڈے لگا دیئے جاتے۔ تاکہ وہ کہیں دوسری بیوی کو مار پڑنے پر دل ہی دل میں خوش نہ ہو۔ لیکن یہی کردار اپنے ٹی بی کے مریض بیٹے کی محبت میں اس کی شادی ایک غریب گھر کی نوجوان بچی سے رچا دیتے ہیں کہ ان کا بیٹا دنیا سے نامراد نہ جائے۔
شب رفتہ کی عورت کہیں مظلوم تھی اور کہیں

بے انتہا ظالم بھی تھی۔ جیسے تارا کی ماسی۔ وہ تارا کی انتہائی حسین بہن کی شادی اپنے عاشق اور نکمے اور نکھٹو دیور سے رچا دیتی ہے۔ اور پھر ساری زندگی اس معصوم پر ظلم کے پہاڑ توڑتی رہتی ہے کہ پڑھ کر روح کانپ جاتی ہے۔ ''خدایا کیا عورت بھی اتنی ظالم اور سنگ دل ہو سکتی ہے۔''

کچھ لوگ ساری زندگی کیسی کیسی شطرنج کی چالیں چلتے رہتے ہیں کہ سوچو تو یقین نہ آئے۔ لیکن جب پروین کے قلم سے حقیقت بن کر الفاظ کے سانچے میں ڈھلتے ہیں تو بے اختیار رونے کو دل چاہتا ہے۔

آزادی کی لہر کے ساتھ ہی ہندوستان میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ واہگہ پار سے جو گاڑی بھی لاہور آتی لاشوں سے اٹی ہوتی۔

ایمن آباد میں ایک تھانیدار نے لوگوں کو انتقام لینے کے لیے بھڑکانا شروع کر دیا۔ لیکن انتقام اور غم و غصے کے اس ماحول میں بھی ایک ہندو بچی، جوان عورت اور ایک بڑھیا کی پورے محلے نے اپنی جان سے بڑھ کر جس طرح حفاظت کی بڑا رقت انگیز منظر ہے۔ یہ واقعہ ہمیں سبق دیتا ہے کہ انسانیت کبھی نہیں مرتی۔

ننھی تارا کو بچپن میں ہی مہاجرت کا دکھ سہنا پڑا۔ کشمیر جنت نظر سے ایک بالکل الٹ ماحول کے قصبہ میں آنا پڑا۔ یہ دکھ ساری زندگی اس کے ساتھ چلا۔ اسی لیے اس کی کہانیوں اور اس ناول میں ہجر اور چھوڑے کا دکھ پایا جاتا ہے۔

تارا کی اپنی زندگی غم و الم اور بیوفائی سے مرتب ہے۔ لیکن جس ہمت، حوصلے اور صبر سے تارا نے زندگی کو جھیلا وہ صرف ایک بہادر، اور باہمت عورت ہی جھیل سکتی ہے۔

پروین کا خمیر اللہ تعالیٰ نے محبت کی مٹی سے اٹھایا ہے۔ اس نے ہر رشتے سے محبت کی ہے۔ بھائی احمد بشیر سے ٹوٹ کر محبت کی اور بھائی کے ساتھ جڑے ہر رشتے کو اپنی جان بنا لیا۔ اپنے بچوں کو دیوانہ وار چاہتی ہے۔ دوست احباب سے بھی بے لوث محبت کرتی تھی۔ پروین نفع و نقصان کا سوچے بغیر محبت کیے جاتی۔ اکثر اوقات ایسی بے لوث محبتیں سکھ کم اور دکھ زیادہ دیتی ہیں۔

ایک نظم کا ایک بند پیاری دوست پروین کی نذر شاعرنا معلوم ہے:

پوچھ رہے ہو بابا لوکا
اور محبت کیا دیتی ہے
من کا میل مٹا دیتی ہے
خوشبو انگ بسا دیتی ہے
پیر نہیں تھکتے ہیں جس میں
ایسا رقص کرا دیتی ہے
سب رنگوں سے جان چھڑا کر
یار کا رنگ چڑھا دیتی ہے
پوچھ رہے ہو بابا لوکا
اور محبت کیا دیتی ہے

☆☆☆☆☆

ہُما فرید کی کتاب ''کہانی حج بیت العتیق''

دردانہ نوشین خان

ہُما فرید کا مجھ سے تعارف بحیثیت مفتی گروپ کی فین اور کتاب کی سنجیدہ قاری کے تھا۔ اب ان کی پہلی کتاب کہانی حج بیت العتیق موصول ہونے کے بعد تعارف کے چند قدم مزید طے ہوئے۔

ہُما فرید ایم فل فزیوتھراپی کے ساتھ انگلش لٹریچر کی ایم اے (نمل یونیورسٹی) ہیں۔ ملتان میڈیکل اینڈ ڈینٹل کالج میں لیکچرار کی جاب کی۔ شادی ہونے کے بعد دو سال سے جدّہ میں رہائش پزیر ہیں۔

ان کی تحریروں میں آنے والے وقتوں میں تین رنگ منعکس ہوں گے انگریزی ادب + میڈیکل تعلیم و تجربہ + ممتاز مفتی تصوف۔

کہانی حج بیت العتیق کا انتساب عکسی مفتی کے نام ہے۔ ''جنھوں نے مجھے لٹریچر سے متعارف کرایا اور لکھنا سکھایا''

لٹریچر سے مُراد غالباً اردو ادب ہوگا۔

کتاب ''کہانی حج بیت العتیق'' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور مقامات حج کے مقدس سفر کی روئیداد ہے۔ حج و عمرہ کے سفر و حضر پر متعدد سفرنامے، آپ بیتیاں، احوال نگاری، مضامین

آرٹیکل کالم اور کتب لکھی جا چکی ہیں۔ مگر ہر معاصر کا اپنا جہاں تخیل آباد ہوتا ہے۔ مقامات و مناسک ایک ہوتے ہیں باطن کی رنگارنگی جدا جدا ہے۔

اس کتاب کے آٹھ ابواب ہیں۔

ہر باب موضوع سے متعلقہ پنسل سکیچ سے شروع ہوتا ہے مثلاً ''طلع البدر علینا'' پر گنبدِ خضرا کا سکیچ ہے۔ کتاب کا کاغذ عمدہ اور چھپائی نمایاں ہے۔

دیارِ غیر میں بسنے والے کسی بھی حساس پاکستانی کی طرح ہُما فرید بھی عرب میں قانون کی عملداری دیکھ کر ایٹمی طاقت مسلم ملک کی غیر متوازن غیر مستحکم حالت زار پہ کڑھنے لگتی ہیں اور وہ سڑک کنارے لائن لگا کر بے ہُنر مزدوروں کو بیٹھا دیکھ کر اُداس ہوتی ہیں اُنھیں کہنا چاہتی ہیں کہ واپس لوٹ جاؤ پہلے آج کی دنیا کا علم سیکھ کر آؤ۔ کمانے کے طریقے سیکھ کر آؤ یوں مت بیٹھو یہاں تنہا۔'' (صفحہ نمبر 14)

کتاب کی کچھ منظر نگاری خوشگواریت کا احساس رکھتی ہے جیسے مسجدِ نبوی میں چوڑیاں چڑھانے والی کے تحفے نے خاموش لبوں پر تبسم کے پھول کھلا دیئے۔ اور جیسے

''بعض اوقات ہم سرسری دعائیں کرتے ہیں اور قبول ہو جاتی ہیں۔'' (صفحہ نمبر 69)

کتاب کی ایک خصوصیت یہ کہ ہُما فرید نے اپنے حج کے احوال کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری حج کی قلمی تصویر کشی کی ہے۔ مساجد، کنویں، اسطوانہ ہر زیارت کا تاریخی پس منظر بیان کیا ہے۔

لکھتی ہیں۔

''وہ زمانہ کیسا ہوگا جب خدا زمین والوں سے رابطے میں تھا۔''

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ ہی میرے من میں ہے۔ میں بھی ایسا سوچتی ہوں۔ وہ زمانہ واقعی فضا، ہوا، آب و گل، زمین آسمان، گرد و نواح ہر ذرے میں عزت دیا گیا تھا۔ جب ایک عورت کے شوہر نے اُسے 'ماں' پکار کر شوہر بیوی کا رشتہ مشکوک کر دیا وہ فریاد لے کر دربار رسالت میں پہنچی تو اللہ کی آیات اُتری کہ اللہ سُن رہا تھا۔

اللہ تو اب بھی ہمیشہ ہر زمانے میں سُن اور دیکھ رہا ہوتا ہے مگر اس طرح جواب نہیں ملتا۔ وہ براہ راست رابطہ نہیں کرتا۔

البتہ اُس کے کاتب فرشتے خاموشی سے ریکارڈ تیار کرتے رہتے ہیں۔

کتاب مذکور میں حج کی اقسام درج ہیں۔ مقامات حج کا اُردو ترجمہ قارئین کے لیے کارآمد معلومات ہیں۔ منیٰ کا مطلب بہاؤ (To flow) ہے۔ یہاں قربانی دی جاتی

ہے جانوروں کا خون بہایا جاتا ہے۔
''یوم الترویہ'' کا مطلب سیراب کرنا ہے سفر سے پہلے جانوروں کو خوب پانی سے سیراب کرنا (یا موجودہ دور میں گاڑیوں کی ٹینکی پٹرول سے فُل کرنا یا خود کو توانا و تیار کرنا)
ہُما نے منیٰ کے کیمپ کا جو احوال لکھا ہے وہ تو بہت آرام دہ ہے فرش پر سونے کے بجائے بیڈ لگے ہیں ہر چھ بیڈز کے بعد چھوٹی سی دیوار اور اُس میں اشیا رکھنے کی الماری ہے الغرض کھانے سے لے کر سونے تک تمام آرام مہیا ہیں۔ میں نے 2005 میں حج کیا تھا۔ سرکاری سطح پر پاکستان سے حج کرنے والوں کو یہ سہولیات میسّر نہیں ہوتی۔
ہُما فرید نے ایک ماڈرن عربی لڑکی کی زبان دانی پہ رشک کیا (صفحہ نمبر 110) اور حسرت سے سوچا کہ میں ایڑھی چوٹی کا زور لگا کر عربی بولنا سیکھ تو لوں تو یہ کانفیڈنس یہ لب ولہجہ کی خوبصورتی جو اللہ نے عربوں کو ان کی مادری زبان کی صورت دی ہے وہ کہاں سے لاؤں گی۔
ہر قوم کو اُس کی مادری زبان پر گرفت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کائناتوں اور جہانوں اور زمانوں کا رب ہے۔ وہ مانگنے والے اور بولنے والے کی نیت اور تقویٰ کو جانچتا ہے۔ ہمارے رسولؐ عالمین کے لیے رحمت ہیں۔ عالمین میں ہر بولی بولنے والے انسان تو کجا مخلوقات تک شامل ہے اور ''کسی عربی کو عجمی پر فوقیت نہیں۔''
میدان عرفان میں جو ہال نما بڑے کمرے بنائے جاتے ہیں اور جہاں ائرکنڈیشنرز چل رہے ہوتے ہیں وہ پرائیویٹ پیکیج والے یا حکمران جماعتوں کے وزیر کبیر ہوتے ہوں گے۔ حج کا اصل لطف عام بندوں میں شمار ہوکر اللہ کے سامنے پیش ہونے میں ہے بشرطیکہ صحت اور جوانی ہو۔
جب بھی حج کا خطبہ ہوتا ہے۔ زیادہ تر عجمی کیونکہ انھیں عربی خطبہ تو سمجھ نہیں آ رہا ہوتا وہ عالم تصور میں رسولؐ پاک کا خطبہ حجتہ الوداع ہی دُہرا رہے ہوتے ہیں۔
ہُما فرید لکھتی ہیں۔
''دعاؤں کا دن تھا۔''
بے شک وہ ایک ایسا دن ہوتا ہے کہ دن گزر جاتا ہے سورج غروب ہونے لگتا ہے دعاؤں کا حرص ختم نہیں ہوتا۔
کہانی حج بیت العتیق، خوبصورت اور گہرے مشاہدے سے مزّین روئیداد ہے۔ حج کرنے والی نیک دل قلم کار کے ذاتی احساسات کا روزنامچہ ہے۔ پڑھنے والوں کو کہاں اُن کے ذاتی تجربات یاد دلاتا ہے وہاں شوقِ سفرِ حج مہمیز کرتا ہے۔
اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر کبیر اطہر کا تصورِ مسیحائی

مسیحائی کا دائرہ کار جسمانی اور روحانی عوارض کو محیط ہے۔ دونوں عوارض انسانی ذات سے متعلق ہیں۔ کچھ عوارض کا تعلق فرد کے بجائے سماج سے ہوتا ہے۔ یہ عوارض براہِ راست لوگوں کی زندگیوں پر اثرات مرتب کرتے ہیں۔ سماجی، مذہبی، سیاسی اور اخلاقی اعتبار سے ان عوارض کے لیے ایک مسیحا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کبیر اطہر معروف آرتھوپیڈک سرجن ہیں۔ اُن کی شاعری میں جابجا انفرادی اور اجتماعی عوارض کی جانب اشارہ ملتا ہے۔ اس مضمون میں اُن کے تصورِ مسیحائی کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی تصورات پر نقد و بحث کی گنجائش ہے۔ جدید شاعری میں شاعر کے منہا کرنے کا جواز ڈھونڈنے کی کوشش کے باوجود اُردو شاعری ہنوز شاعر کو منہا کرنے میں ناکام دکھائی دیتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ہمارا نظامِ زندگی ہے۔ مغرب میں فرد کو اکائی کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہے۔ جب اُس کی ذات میں مداخلت کی گنجائش نہیں ہے۔ ہمارے ہاں فرد کو اجتماعی دائرہ کار میں دیکھا جاتا ہے۔ یعنی اُس کے ذاتی معاملات کو سماجی سطح پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ سماج کے ضابطے اور اخلاقیات اُسے خاص دائرے میں رکھتے ہیں۔ سوچ، عمل اور اظہار میں سماج مانع ہوتا ہے۔ عوارض کی تمام تر صورتیں جسمانی، روحانی، انفرادی اور اجتماعی نوعیت کی ہوتی ہے۔ جہاں ایک کارِ خیر کا آغاز ہوتا ہے۔ شاعر جب اپنی ذات سے باہر نکل کر دیکھنے لگتا ہے تو ایک مسیحا جنم لیتا ہے۔ افسوس ہمارے اکثر شعرا تمام زندگی ذات میں رہ کر گزار دیتے ہیں اور اُنھیں باہر نکل کر دیکھنے کی توفیق نہیں ہوتی ہے۔

بہت پہلے ڈاکٹر کبیر اطہر کی ایک غزل میرے مطالعے میں آئی تھی۔ دو شعر ملاحظہ کیجیے:

بس اتنا دخل تھا میرا خدا کے کاموں میں
میں مرتے لوگوں کی جانیں بچایا کرتا تھا

شاہد اشرف

مرے سپرد کفالت تھی بے زبانوں کی
میں رزق اِس لیے وافر کمایا کرتا تھا

.....

ان اشعار نے مجھے اس مضمون کا موضوع ڈھونڈنے میں مدد دی ہے۔ یوں میں نے اِس آئینے میں ڈاکٹر کبیر اطہر کی شاعری کو دیکھنا شروع کیا تو ایک جہانِ حیرت کو اپنا منتظر پایا۔
پہلے رومانی سطح پر مسیحائی کا انداز دیکھیے۔ محبت میں مسیحائی کا یہ پہلو حد درجہ ندرت کا حامل ہے۔ میرا خیال ہے کہ بہت کم شعرا نے اس منطقے کو دریافت کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں:

تجھے اے خوش بدا ٹیسیں نہیں میں لطف دوں گا
مجھے کیکر نہیں شمشاد سے توڑا گیا ہے

.....

ابھی تو ٹوٹے ہوئے دل پہ کام جاری ہے
بحال چشمِ تمنا کا بھی بھرم کریں گے

یہ ہے شراب کی بوتل، یہ آبِ زم زم کی
جسے جہاں سے ملے گی خوشی بہم کریں گے

.....

ذاتی سطح پر مسیحائی کا تجربہ کم ملتا ہے۔ میں ڈاکٹر کبیر اطہر کے یہ شعر پڑھ کر سرشار ہو گیا ہوں۔ اس کیفیت کا اظہار ذاتی تجربے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ دو شعر دیکھیے:

رونے کے ساتھ جس پہ بہت ہنس رہا ہوں میں
اس حادثے میں لطف کا پہلو زیادہ ہے

.....

وہ تُو ہے مجھ میں، جس کی حفاظت کے واسطے
باہر سے خاردار بنایا گیا مجھے

نہیں ہے میرے دکھوں کا مرے سوا کوئی
خیال اس لیے رکھنا ہے مجھ خریں کا مجھے

.....

کیا مسیحائی کے تصور میں پشیمانی کا تصور بھی ممکن ہے؟ مجھے ایک شعر ایسا بھی ملا ہے جو بیک وقت دونوں کیفیات کی غمازی کرتا ہے۔ رشتوں میں احساسِ تحفظ اور اس تحفظ میں کوتاہی کا یہ زاویہ بھی اُردو شاعری کی زینت بن گیا ہے۔ یہاں ترجیحات کے بجائے میلانات کو دخل حاصل ہے۔ ہم معاملات میں اکثر اوقات اس غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

گم صم ہوں بیوی بچوں کی جانیں بچا کے میں
ماں کی طرف تو دھیان گیا ہی نہیں مرا

.....

ڈاکٹر کبیر اطہر کے تصورِ مسیحائی میں روح اور جذبے کا ایسا امتزاج بھی ملتا ہے۔ جسے تخلیقی سطح پر بیان کرنا نہایت فنکارانہ صلاحیتوں کا مظہر ہوتا ہے۔ وہ عام ذہن کے تمام ممکنہ زاویوں سے الگ ایک نئے زاویے کی جستجو میں رہتے ہیں اور اُسے ڈھونڈنے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ میں حد درجہ اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر کبیر اطہر نے اپنے مجموعہ کلام "نم" کے عنوان کا انتخاب اِس شعر سے کیا ہے:

تکلیف میں ہوں پیاسے پرندوں کے غم سے میں
کچھ کو بچا بھی سکتا تھا آنکھوں کے نم سے میں

.....

آنکھوں کے نم سے پرندوں کی پیاس بجھانے کا تصور میرے مطالعے میں پہلی بار آیا ہے۔ ویسے بڑی تعداد میں ایسے شعر موجود ہیں جو اپنی ترتیب و تزئین میں پہلی بار دیکھنے میں آئے ہیں۔

کبیر اطہر اپنے کارِ مسیحائی میں آخری حد تک جا سکتے ہیں البتہ وہ اپنی ہمت اور حوصلے کی راہ میں تھکن سے انکاری نہیں ہیں۔ اس کے باوجود اُمید کا دیا بجھنے نہیں دیتے ہیں۔ اس شعر کے کئی زاویے قاری کی توجہ کھینچتے ہیں۔

پہنچوں گا ان دلوں میں بھی جن تک نہیں گیا
میں شعر کہتے کہتے اگر تھک نہیں گیا

.....

کر دیا میں نے ہواؤں کے حوالے ورنہ
غم کو خوشبو میں بدلنے کی روایت کم ہے

.....

تعمیر میں تخریب کا تصور تو عام پایا جاتا ہے مگر کیا اس میں کوئی خاص قرینہ ایسا ہو سکتا ہے کہ تخریب کی جانب دھیان ہی نہ جائے اور تعمیر دل و دماغ پر غالب آجائے؟ اس نوع کی واردات ہر گز عمومی نہیں ہوتی ہے۔ ایسا شعر خیال کی ترتیب سے زیادہ جذبے کی سچائی سے عبارت ہوتی ہے۔

تب تک اُجارتا رہا میں باغ شہر کے
پھولوں سے جب تک وہ مکاں ڈھک نہیں گیا

.....

اجتماعی سطح پر کارِ مسیحائی کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ اُردو شاعری شاعر کو منہا کر کے تخلیق کو دیکھنا افورڈ نہیں کرتی ہے۔ ایک آرتھوپیڈک ڈاکٹر اور شاعر کو منہا کر کے دیکھنے سے اس شعر کا حسن غارت ہو جائے گا۔ ملاحظہ کیجیے:

اپاہجوں کے لیے رونقِ حیات ہوں میں
کسی کا پاؤں ہوں میں اور کسی کا ہاتھ ہوں میں

.....

دوسروں کے لیے رونقِ حیات بننے والا شاعر اپنی زندگی کی پروا نہیں کرتا ہے۔ یہی سچے شاعر کا منصب ہے کہ وہ صرف شعر نہ کہے بلکہ جب کبھی کچھ کر گزرنے کا موقع آئے تو سینہ تان کر کھڑا ہو جائے۔ گو درج ذیل شعر صرف مشاہدے کا مرہونِ منت ہے۔ اس کے باوجود اس صداقت سے انکار ممکن نہیں ہے:

جان گنوا بیٹھا ہوں میں اُوروں کے جھگڑے میں
ہمت کی تھی خوابوں کو تعبیر دلانے کی

.....

کارِ خیر اور کارِ مسیحائی ایک ہی پودے کے دو مختلف پھول ہیں۔ کبھی کبھی یہ دونوں ایک ہی شاخ پر اکٹھے ہو جاتے ہیں اور اس طرح ان کی قدر مزید بڑھ جاتی ہے۔ وہ راست فکر شاعر ہیں اور اس نوعیت کے درجنوں مضامین "نم" میں ملتے ہیں۔

ٹوٹے دلوں کو جوڑتا رہتا ہوں اس لیے
جھگڑے محبتوں کے نہ پہنچیں وکیل تک

رکھتا ہے پیش پیش بھی ہر کارِ خیر میں
اور خود کو آشکار بھی کرنا نہیں مجھے

.....

یہ ڈاکٹر کبیر اطہر کے تصورِ مسیحائی کا مختصر جائزہ ہے۔ ان کے دیگر موضوعات پر الگ الگ جائزے اپنے نقاد کے منتظر ہیں۔ میں مضمون کا اختتام کتاب میں شامل نعت کے اس شعر سے کرتا ہوں:

یہ میری آنکھ کھلے آپ کے زمانے میں
میں سو کے اُٹھوں تو ناممکنات سا کچھ ہو

☆☆☆☆☆

افتخار شوکت، امید اور انسانیت کا شاعر

شاعری کو شاعر سے الگ نہیں رکھا جا سکتا۔ فی زمانہ شعر کہنے کی دھن میں اکثر شاعر آداب و تہذیب کا دامن چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ یہی للکار مشاعروں کی گونج بن کر رہ گئی ہے لیکن افتخار شوکت چودھری کی ترجیحات ذرا مختلف ہیں۔ حمد و سلام میں بھی شعریت سے زیادہ توصیف اور شکر کے ساتھ اس طمانیت کی عکاسی بھی ہے جو فقر کا خاصا ہے:

ناداں اس کے رازوں کو کیسے سمجھیں
جو کرتا ہے ٹھیک کیا کرتا ہے رب

ہاتھ اُٹھا کر اونچی دعائیں کیوں مانگوں
خاموشی بھی میری سنا کرتا ہے رب

.....

اس سے یہ مراد نہیں کہ افتخار کے ہاں تغزل اور روانی کی قلت ہے۔ دیکھیے:

ذات وہم و گماں سے باہر ہے
حمد اس کی بیاں سے باہر ہے

سارے کردار اس کے ہیں لیکن
پھر بھی وہ داستان سے باہر ہے

.....

ساز دھیما سہی لیکن سوز کی لفظی تصاویر مزین ہیں۔ افتخار کی شخصیت کا مزاج اس کے اشعار میں بولتا ہے۔ شائستگی، نرمی، ٹھہراؤ اس کی شاعری کا خاصا ہے۔ دھیمے لہجہ میں سماجی مسائل کی چیخ پکار نہیں بلکہ محبت و برداشت کا بیانیہ ہے:

عشق کو اپنا دین کرو
خوابوں کی تدفین کرو

ورنہ مارے جاؤ گے
اتنی مت توہین کرو

.....

شاعر جذبات کی تشہیر میں ضابطوں کا پابند دکھائی دیتا ہے:

آزمائے دوستوں کو آزمائیں کس لیے
روز شب ہم پھر سے اپنا جی جلائیں کس لیے

.....

افتخار چونکہ وکیل ہے اس لیے دلائل سے بات کرتا ہے اور بنیاد تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ تجزیاتی انداز بھی اس کے ہاں نمایاں ہے:

سعدیہ بشیر

اس لیے تو عداوتیں ہیں بہت
اپنی اپنی ضرورتیں بہت

کاغذ کو تم نے غور سے دیکھا نہیں کبھی
کچھ نقش اور ہوتے ہیں تحریر کے سوا

سیدھے سادوں کو بھی ہشیار بنا دیتے ہیں
دھوکے دنیا کے سمجھدار بنا دیتے ہیں

.....

اچھا شعر وہی ہو سکتا ہے جو دل کو چھو لے یا چونکا دے..... افتخار شوکت چودھری کے ہاں ان دونوں سطحوں پر سادگی سے کہے گئے اشعار سامنے آتے ہیں:

چاند آدھا رہ گیا تھا رات آدھی رہ گئی
بیٹھے بیٹھے کھو گئے ہم بات آدھی رہ گئی

بے سبب مصروفیت نے اس طرح کھایا مجھے
ایسے لگتا ہے کہ میری ذات آدھی رہ گئی

.....

جدت کی تلاش نے بے سبب کی مشکلیں بڑھا دیں ہیں۔ Deviesw.h نے اپنی نظم leisure میں دور جدید کے اسی المیے کا ذکر کیا ہے جس نے ذہنی خوشی اور طمانیت کو ناپید کر رکھا ہے۔ اب ہر شخص شکوہ شکایت سے پر ہے۔ ذات کے نہاں خانے خالی ہیں اور مصنوعی محبت کی تلاش مصلحت کے دیچوں سے لپٹی ہوئی ہے۔ یہ المیہ فردیت کو کھا گیا ہے۔ بھیڑ چال نے فرد کے باطن پر ضرب لگائی ہے۔ افتخار نے جدت کو روایت کے دائرے میں ہی رکھا ہے۔ یہ عنصر نہ صرف اشعار بلکہ شخصی رویہ میں بھی نمایاں ہے۔ تحمل، مروت اور شائستگی شاعر کا اسلوب ہے۔ اسی فکر کی بلندی کو صرف اخلاقیات سے باندھ کر رکھا ہے:

جانتا ہوں چاہوں بھی تو پروے کر سکتا نہیں
پھر کسی معصوم کو سپنے دکھاؤں کس لیے

.....

شاعر غم زمانہ سے گزرتا ضرور ہے مگر وہاں رک کر اس کی تصاویر نہیں بناتا۔ اس کے ہاں شعر کہنا مقصد حیات نہیں بلکہ دل کی آواز ہے۔

نیند میں ماہتاب سا کچھ ہے
خواب میں اور خواب سا کچھ ہے

روز تازہ سبق سکھاتی ہے
زندگی میں کتاب سا کچھ ہے

.....

شاعر انسانیت سے منہ نہیں پھیر سکتا۔ اس کی حساسیت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ زندگی کے کرب و سوز کی تصاویر دیکھے اور ان کی تصاویر بنائے۔ زندگی کے کتنے ہی منظر نظر سے اوجھل بھی رہ جاتے ہیں اور بہت سے بہروپ بھی سامنے آتے ہیں۔ کچھ لوگ مصنوعی حساسیت کے زیر اثر زندگی کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ فی زمانہ شاعری کا دامن داخلیت کے حبس زدہ

موسم سے بھرنے کے دعویٰ دار بھی ہیں۔ اور ویٹی لیٹر پر مصنوعی آکسیجن سے تناسب کو زندہ رکھنے والے رویے بھی۔ وہ توازن اور زندگی کے حقیقی رویے ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ افتخار شوکت کی شاعری میں زندگی بعینہٖ موجود ہے۔

زندگی کی تلخ اور سفاک سچائی کا بیان دیکھیے:

ہر سو معاشرے میں خباثت کے ڈھیر تھے
کیسے اسے بچاتا نفاست پسند تھا

ہر چیز تھی بکاؤ محبت ہی کیوں نہ ہو
ہر شخص میرے شہر کا عجلت پسند تھا

.....

شاعر کی آنکھ مسائل کا ادراک رکھتی ہے اور دل تڑپتا ہے۔

ایسی بستیاں بھی ہیں ایسے گھر بھی ہیں جن میں صرف ایک گڑیا کو بچیاں ترستی ہیں

.....

اس قدر فاصلے پہ ہے انصاف
فیصلہ فیصلے سے باہر ہے

قافلے نے بھٹکنا ہے آخر
رہنما قافلے سے باہر ہے

.....

شاعر ہو اور نازک خیال نہ ہو ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ افتخار کے ہاں خالص رومانوی اشعار بھی ہیں جس میں محبوب بھی ہے۔ غم زمانہ بھی اور وہ تمام تر اندیشے بھی جو محبت میں لاحق رہتے ہیں۔

جا بجا پھولوں پہ اڑتی تتلیاں
فصل گل میں دل کی حالت اور ہے

.....

خواب کے دریچے دل و دماغ کے مقفل زنداں میں ثمر بار اشجار کا رستہ بنا دیتے ہیں۔

جس قدر بھی دیے بناتا ہوں
کب وہ اپنے لیے بناتا ہوں

راستے آپ ہنسنے لگتے ہیں
میں تو بس زاویے بناتا ہوں

.....

اس تیز رفتار زندگی نے جہاں بہت سے چہرے گنوا دیے ہیں وہیں ان گنت مناظر دھندلا بھی دیے ہیں۔ ہر شعبۂ زندگی ہیولہ بن کر رہ گیا ہے:

اہمیت انسان کی سب سے مقدم تھی یہاں
اس لیے ہر موڑ پر ہی معتبر تھی زندگی

.....

اور موجودہ حالات کے تناظر میں:

خون کے سائے ہیں رقصاں اب جدھر بھی جائیے
کب انھی گلیوں میں پہلے پر خطر تھی زندگی

.....

افتخار شوکت جیسے انسان اس دھند لکے میں صبح صادق کی روشنی ہیں جن کا دم اس پُر آشوب دور میں کسی نعمت سے کم نہیں۔

☆☆☆☆☆

زبان کی کمان سے نکلے لفظ تیر تو کہیں خوش کلامی کا مرہم بنتے ہیں

زبان کی اہمیت اور لفظوں کے اثرات

انسانی بچہ اپنی پیدائش سے دو سال تک بولنا شروع کر دیتا ہے مگر کون سا لفظ کس وقت بولنا ہے یہ سمجھنے کے لیے ساری زندگی لگ جاتی ہے اسی لیے بولنے کے وقت چپ رہنا اور چپ رہنے کے وقت بولنا زبان کے دو عیب بیان کیے گئے ہیں۔ کون سی بات کب کہاں اور کیسے کہی جاتی ہے اگر یہ سلیقہ ہو تو ہر بات سنی جاتی ہے۔ ہر انسان کی شخصیت اُس کی زبان کے نیچے پوشیدہ ہوتی ہے جب زبان کے لفظوں کا پہرہ دینے والے لوگ ختم ہوئے تو بیان حلفی اسٹام پیپر جیسے کاغذوں کے ٹکڑے آ گئے۔ زبان دل و دماغ کی ترجمان ہوتی ہے اور دل و دماغ کس کے ترجمان ہیں یہ انتخاب ہی انسان کو معاشرے میں منفرد حیثیت کا حامل بناتا ہے۔ عظیم ذہن اپنی سوچ اور سلیقہ گفتگو کی وجہ سے لوگوں کے زہنوں اور زبانوں میں موجود رہتے ہیں۔ جہاں زبان کا اچھا استعمال ان گنت محبتیں کمانے میں آگے ہے وہاں برا استعمال بھی اپنی نفرتوں میں پیچھے نہیں رہا۔ زبان کے زخم اپنے نشان مٹنے نہیں دیتے اس لیے اچھی گفتگو پہ عبور نہ ہونا کوئی گناہ نہیں ہے مگر بری گفتگو سے کسی کے دل و دماغ کو زخمی کر دینا زمین کے سارے حیوانوں کو پیچھے چھوڑ دینا ہے۔ تکلیف دہ باتوں کے وار کرتی زبان کے سامنے خاموشی کی دیوار بنا لینا اچھے خون اور تربیت کا پتا دیتا ہے۔ اسی لیے خاموشی کو آوازوں کا مرشد کہا گیا ہے جو جہالت کے بھی عیب چھپا دیتی ہے۔ برے بول کا کوئی رتبہ نہیں جبکہ برداشت والے ہی مقام پاتے ہیں۔ محبوب انسان وہی ہے جس کی زبان سے گفتگو کا وہ ذائقہ نکلے جو سننے والے کانوں کی بھوک بڑھا کر زخمی ذہن و دل پر بنے بدکلامی کے پھوڑے کو شفا بخش مرہم ملنے کے احساس میں مبتلا کر دے۔ لفظوں میں تاثیر لانے کے لیے ناقص گفتگو سے کوسوں دور رہنا پڑتا ہے۔ مجھ سے ہو مگر میرے لیے کچھ نہ ہو یہ عمل کم ظرفوں کے حصے میں نہیں آتا۔ خوش کلامی کا ہنر بڑی قربانی سے

ظفر اقبال ظفر

آتا ہے جہالت کی گرم ریت پر شعور کی تلاش میں عقل کو ننگے پاؤں چلنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر بنجر دل دماغوں کو سرسبز کرنے والے چشمے زبان سے پھوٹتے ہیں۔ اپنے زخموں پر خوش نما رنگوں کے پھاہوں کے سینکڑوں پرت سجانے پڑتے ہیں تب کہیں گفتگو کے سلیقے پر رنگ برنگے جھالر لگانے کا سلیقہ ہاتھ آتا ہے۔ جس کا بولنا اچھا نہ ہو اُس کی خاموشی خوبصورت ضرور ہوتی ہے۔ عظیم انسان بنانے والے والدین کے گھروں میں بچوں کے جسموں سے زیادہ اُن کے ذہنوں کو پالنے پوسنے پر دھیان دیا جاتا ہے۔ پاکیزہ زبانوں کی گفتگو بھی عبادت میں شمار ہوتی ہے اور ان کے ہاں گستاخ قہقہوں اور بے معنی باتوں کے جواب میں زبان نہیں کھولی جاتی۔ جہاں زبان کے استعمال کے لیے ذہن کی بڑی محتاط ترتیب کرنی پڑی ہے وہاں زبان کا اپنا وجود بھی اپنے تعارف کے لیے بڑے معتبر اشارے دیتا ہے گوشت کی ایک کونپل جس کی نا آنکھیں ہیں نا دماغ ہے مگر یہ منہ کے اندھیروں میں غذا کو دانتوں کے نیچے لاتی ہے جس طرح زبان میں ذائقہ بتانے کی حس ہے اسی طرح زبان سے ادا ہونے والے لفظ بھی سننے والے کے دل و دماغ میں اپنے ذائقے کا اثر چھوڑتے ہیں اسی بنیاد پر لوگ کہتے ہیں کہ آپ سے گفتگو سے بہت مزہ آتا ہے کیونکہ ہر سماعت میں لفظوں کا ذائقہ چکھنے کی اصلاحیت ہوتی ہے جو میٹھی گفتگو سے محبت اور کڑوی گفتگو سے نفرت کا نتیجہ دیتی ہے۔ ایک محب وطن جاسوس دشمن ملک میں پکڑا جائے تو وہ درد کے ذریعے اس کی زبان کی گرہ کھولنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اپنی جان تو دے دیتا ہے مگر زبان نہیں کھولتا کیونکہ اسے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا بولنا اس کے وطن کے لیے نقصان کا باعث ہوگا۔

اس تناظر میں غور کیجیے کہ خدا نے عالم ارواح سے ہماری روح کو دنیا میں جسم کا لباس پہنا کر جو اتارا ہے یہ خدائی مقصد کی وہ عکاسی ہے جس میں انسان نے خدا اور خدا کے بندوں کی وہ ترجمانی کرنی ہے جس میں رضا و خوشی کا نتیجہ نکلے بس اسی میں حقوق اللہ اور حقوق العباد پوشیدہ ہیں اگر خدا نے انسان کا دل اپنے بسیرے کے لیے بنایا ہے تو انسان کی زبان دوسرے انسانوں میں بسنے کے لیے بنائی ہے۔ وہ دل خدا کا گھر نہیں ہو سکتا جس میں نفرت حسد کینہ تکبر جیسے زہر بنتے ہوں اور خدا اُس زبان سے اپنا نام سننا بھی پسند نہیں کرتا جس سے دوسروں کو کسی قسم کا نقصان پہنچتا ہو۔ یہ حدیث شہادت ہے کہ مومن وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرا مومن محفوظ رہے۔ لفظ لوگوں کے لیے اور خاموشیاں خدا کے لیے نکھار لیجیے۔ زبان کو فقط گوشت کا ٹکڑا سمجھنے والے اس سے ادا ہونے والے لفظوں کی ذمہ داری سے غافل رہتے ہیں جبکہ منہ میں رکھے گوشت کے ٹکڑے کو زبان

سمجھنے والے اپنے کہے ہوئے لفظوں کا پہرہ دیتے ہیں - اگر خدا لفظوں کو یہ طاقت و اختیار دے دے کہ وہ اپنی حرمت و پاسداری کی خلاف ورزی کرنے والی زبانوں کو گرفت میں لے لیں تو وہی زبانیں بولیں گی جو بولنے کا حقیقی حق ادا کرتی ہوں گی اور باقی زبانیں قید خاموشی میں گونگی زندگی جینے پر مجبور ہو جائیں۔ اگر زبان سے زخم دیئے ہیں اور پھر بھی بول رہے ہیں تو سمجھ جایئے کہ خدا زبان کے وار کو زبان کے ہی مرہم سے بھرنے کی مہلت دے رہا ہے کبھی کبھی تو میں خدا کا اس اعتبار سے بھی شکر گزار ہوتا ہوں کہ اُس نے مجھ جیسے جاہلوں پر کتنا بے پرواہ کرم کر رکھا ہے کہ غیر معیاری گفتگو جھوٹ غیبت سخت الفاظی بدکلامی جیسے برے استعمال کے باوجود زبان بندی نہیں کرتا ورنہ میرا مجھ میں ہے کیا جو خدا کی رضا کے بغیر بھی میرے ساتھ کھڑا رہے پھر بھی میں یہ سوچ کر کانپ جاتا ہوں کہ روز آخرت اگر خدا نے میرے خدائی اور انسانی ناراضگی والے سارے لفظوں کو زبان کی سزا بنا دیا تو میری تو اپنی بڑی زبان نہیں ہے جتنے اس پر آنے کے لیے چھالے قطاریں بنالیں گے۔ اگر ہم ایک بار خدا کا نام لیں تو اس کا اجر ہمارے حق میں رکھ دیا جاتا ہے تو کیا کسی کے لیے نکلے تکلیف دہ کلمات ہماری تکلیف بن کر وقت مقرر میں انتظار نہیں کریں گے۔ لفظ سنائی دیتے ہیں مگر اس کے اثر دیکھائی دیتے ہیں آنکھوں کے پردے ہٹنے کی دیر ہے۔ محبت کی کوئی زبان نہیں ہوتی مگر ہر زبان محبت کے لیے ہی ہوتی ہے۔ اگر آپ سے گفتگو کرنے والے دل و دماغ لطف سے لبریز ہو جاتے ہیں تو گیلی و پھیکی زبان کے گھر سے میٹھے لب و لہجے کے پیالے میں شفا بخش لفظوں کے لنگر تقسیم ہونے پر خدا کے حضور سجدہ شکر ادا کیجئے۔ کتنے ہی لوگ ایسی زبان رکھتے ہیں جو کسی سے اپنا مسئلہ کہتے ہیں تو ان کی ضرورت کا برتن خالی پلٹ آتا ہے اور کچھ ایسی زبانیں بھی ہیں جو دوسروں کے لیے دولت نہیں خون کا عطیہ مانگتے ہیں اور بیگ کم پڑھ جاتے ہیں۔ زبان تو وہ ہے جس کے لفظ آسمانی کیفیت کی تاثیر سے لبریز ہوتے ہیں۔

اگر میں اس تحریر کے لفظ لفظ سے تاثیر زدہ زبان کے حصول واسطے مشورہ مانگوں تو مجھے سب سے پہلے ناقص مفہوم کے الفاظ نا بولنے کا تاحیات روزہ رکھوا کر لفظوں کے چناؤ پر لگایا جائے گا - جھوٹ غیبت بدکلامی الزام تراشی سمیت جتنے بھی زبان کے عیب ہیں ان سے اپنی زبان پاک کر لیجئے نہ صرف دعائیں قبول ہوں گی بلکہ آپ کا بولنا لوگ دل کے کانوں سے سنیں گے اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ خدا سے گفتگو کریں گے تو جواب ملا کرے گا مگر جواب سننے کے لیے کانوں پر بھی زبان جیسی محنت کرنا ہوگی۔

☆☆☆☆☆

مظفر بخاری کی ''دریائے خوں کے شناور'' ماتم کناں بربریت

شہزاد تصور

مظفر بخاری نے بظاہر دیگر احباب کی طرح مملکت خداداد کے وجود میں آنے اور اپنے آباؤ اجداد کے زیر سایہ اسی سرزمین کو دنیاوی جنت تصور کرتے ہوئے کسی طور یہاں پہلا قدم رکھنے کو ہی اپنی زندگی کی ہر خوشی کا محور و مرکز مان کر اس طرف رخ بھلے کتنی مشفق انگلیوں کو تھام کر کیا لیکن اس ہفت اقلیم کے سفر کا آنکھوں دیکھا احوال جس کا ہر لمحہ خوں رنگ اور ہر اٹھنے والے قدم کا نجانے کتنی لاشوں کے درمیان سے ہو کر گزرنا جیسے ایک معصوم بچے کی روح میں کوئی ایسا کاری زخم تھا جس کا کبھی مندمل نہ ہو پانا بہر حال طے دکھائی دیتا ہے جس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت ہی کیا کہ ''دریائے خوں کے شناور'' کا ہر لفظ اور ہر سطر اپنے اندر سبھی کچھ لئے ہے۔ یہی وہ ناسور ..... جو بہر حال ایک روایتی موضوع سہی..... لیکن مظفر بخاری کے لیے اپنے ڈھنگ میں مکمل سچائی کے ساتھ بیان کرنا یوں تھا جیسے اس لمحہ لمحہ پل صراط کی داستاں دل میں کندہ کوئی ایسا نشان ہو جس کی تمام تر جزئیات ان کی نس نس میں سمائی تھیں اور جب انہیں اپنے اندر مدفن ایک قبرستان کی کھدائی کا موقع ملا تو سالہا سال مسائل کی گرد میں اٹے اور گونا گوں الجھنوں کے ملبے تلے دبے ایک ادیب کے ساتھ ساتھ پلنے والے زخم جیسے ایک بار پھر سے جاگ اٹھے اور جس طرح کبھی وجود میں آئے اسی طرح قرطاس پر متحرک صورت خود بخود ڈھل گئے۔ مظفر بخاری بھی شاید اپنے ہی الفاظ کے ڈسے ہوئے تھے اسی لئے بظاہر پرسکون اور معتدل..... انتہائی سادہ بیانی لیکن زندہ جاوید روانی اور فنکارانہ گرفت قائم رکھتے ہوئے معمولی واقعات کے ذریعے دراصل اپنے اندر موجود سب کچھ لاشعوری طور یوں اگل دیا جیسے سمندر بھی ڈوبنے والوں

کی لاش کا بوجھ اپنے اندر زیادہ دیر نہ رکھ پانے اور بالآخر سطح تک پہنچا کر اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی تسکین حاصل کیے بغیر نہیں رہ پاتا۔

معلوم نہیں غلامی اور جبر و استبداد سے نجات کے خواب کو برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کی معصومیت اور سادگی سمجھا جائے یا چالاک و مکار، شاطر اور عیار، لوٹ کھسوٹ، ڈاکہ زنی اور زیادہ سے زیادہ سمیٹ اور سب کچھ چھین لینے کے عادی و مفاداتی ماہرین کی کامیابی کا ایک تسلسل.....اک خواب جو دیکھا گیا لاتعداد محرومیوں کے شکار لوگوں کی حسرت زدہ آنکھوں نے جو کبھی اپنوں اور کبھی غیروں کی رعیت میں ہمیشہ سب کچھ گنواتے چلے آنے کی روایت ہی کو تقدیر الٰہی سمجھتے چلے آئے تھے لیکن ان سب خرافات سے ہمیشہ کے لیے نجات ایک سنہرا خواب.....اک ایسی طلسماتی تعبیر..... کہ جس کے حصول کے لیے سب کچھ حتیٰ کہ نہ صرف اپنے انتہائی پیاروں بلکہ اپنی جان تک قربان کر دینے والوں کو بالآخر ملی بھی تو بچی کھچی اک لٹی پٹی تعبیر.....!

صدیوں سے یونہی لٹتے چلے آنے، محرومیوں کو موروثی مقدر، نسل در نسل غلامی منشائے الٰہی، زور آوروں کے سامنے سر تسلیم خم کیے رکھنے کو بھی مثل اک مقدس فریضہ اور غربت و مفلسی ہی کو زندگی کا دوسرا نام کسی نہ کسی طور سمجھتے چلے آنے اور انفرادی شناخت، شخصیت اور پہچان سے کلی طور لاعلمی کی سیاہ کثیر کے اس پار کسی دوسری دنیا کے تصور کی طلسماتی کہانیاں سنتے چلے آنے والوں کے لیے محرومیوں اور ناکام حسرتوں کے قبرستان میں بھٹکتے رہنے کی لت سے چھٹکارے جیسے کسی خیال کے غلطی سے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں بھی کہیں دور تک بھٹکنے کی مجال نہ تھی۔ نسل در نسل اذہان کی پروگرامنگ ہی کچھ اس قسم کی ادباش بے رحمی کے ہاتھوں ہوئی تھی کہ تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا اور ہر نوع کی جدتیں بھی اس کے منہ لگنے کے بجائے کچلے ہوئے مصلوب اذہان کو اکڑ دکھانے پر اکتفا میں ہی عافیت سمجھتیں۔

یوں انسانی فکر کی بلندیاں اور ارتقائی عملداریاں اس دور میں بھی امرا تک محدود اور اسی ان دیکھے دائرے میں ناز و نخرے دکھاتے ہوئے انہی کی رکھیل بنے رہنے میں ہی اپنی شان قائم رکھے ہوئی تھیں۔

جب وقت کا پہیہ آگے بڑھ رہا تھا تو شعور کی لہر بھی بلوغت کی حدود میں داخل ہوتے ہوئے کچی عمر کے بچوں کی طرح دھیرے دھیرے یوں پیچھے چلنے لگی جیسے بچہ گیند کا تعاقب کر رہا ہو۔ وقت کا سفر بھی رکا کب ہے.....بس گاہے بگاہے بچے پر اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے یونہی مسکرا دیا کرتا۔ کب بھولا تھا غاروں کا زمانہ اسے..... جب فطری شعور نے غاروں کو خیرباد کہا تو وقت کی آنکھ سے اصل کا چمکے سے دکھائی نہ دیتے ہوئے بھی ساتھ چپک آنا کہاں چھپ سکا تھا، ہزار ہا صدیوں کی جھریاں لئے چہرے پر اس ابتدائی وقت

آنے والی مسکراہٹ یقیناً ذومعنی رہی ہوگی۔ خیر منازل طے ہوتی رہیں۔ کائناتی شعور ازل سے ہی انسانی ذہن کو کسی نہ کسی طور مہمیز دینے کے حوالے سے ہمیشہ فیاض رہا۔ کروڑہا شعور اجتماعی شکل اختیار کر گئے۔ قائدؒ اعظم دوراندیش، زیرک اور مدبر ہونے کے علاوہ صاحب دل بھی تھے اور کروڑوں مسلمانوں کے درد کو اپنا سمجھ لینے کی وجہ سے الگ وطن کی اہمیت سے بخوبی آشنا ہونے کے باعث بس اپنی دھن میں مگن دن رات ایک کئے ہوئے تھے۔ عجب جنگ تھی جس کی بنیاد ایک طلسمی حصار..... جس میں ہر خواب اور آسودگی کی تکمیل موجود تھی۔ مظفر بخاری نے جب اپنی کتاب "دریائے خوں کے شناور" میں پون صدی سے زائد کی یادوں کو قرطاس پر رقم کیا تو ہر حرف، ہر لفظ جیسے تڑپ کر رہ گیا اور مفہوم میں ڈھلنے تک اپنی اپنی ذات میں کچھ ایسی کٹی پھٹی صورت اختیار کر گیا کہ تقسیم کے وقت انسانیت کو مذہب کے نام پر لگنے والا ہر زخم دہائی دے اٹھا۔ وقت کی تہہ میں دبے سبھی دکھ اک بار پھر سے لو دے اٹھے اور تقسیم کے وہ سبھی کردار جو اپنی اپنی مناسبت کے لحاظ سے الفاظ کے ذریعے دوبارہ مجتمع اور متحرک ہوئے تھے بشمول سبھی مذہبی جلادوں کے جو اپنے مظالم اور ناحق مقتولوں کے ساتھ ہونے والی ماتم کناں بربریت سے کتابی حدود میں گڑگڑا کر تاسف ہی نہیں معافی کے طلبگار تھے۔ مذاہب کی آڑ میں جب وقت کی آنکھیں بھی ہندوپاک کی حدود میں ہونے والی بے رحمی کے محض ایک کھیل تماشہ بنے رہنے اور ظلم و ناانصافی پر انگشت بدنداں رہ گئیں وہاں قاری کے دل و دماغ اور سوچ کی بنیادیں بے ساختہ ہلاکو اور چنگیز خان..... بھلے شخصیات الگ لیکن ان کے بدترین کارناموں کی یکجائی کے نتیجہ میں ہونے والی بربریت کی مثالوں کو مات ہوتے دیکھ کر لرز اٹھیں کہ اگر ظلم، ناانصافی اور بربریت کا نام لیا جائے تو ہندوستان کی تقسیم کے وقت اگر ہلاکو اور چنگیز خان کندھے سے کندھا ملائے کھڑے ہوتے تو یقیناً اپنا سر پیٹ کر رہ جاتے کہ اگر ان سے زیادہ بے رحمی کی گنجائش موجود تھی تو یہ موئی ٹیکنالوجی اور جدید ہتھیار اس وقت کہاں تھے۔ بلاشبہ چنگیز خان تو یہاں تک کہہ دیتا کہ اگر خبر ہوتی تو کسی نہ کسی طور تقسیم کے وقت اپنی موجودگی یقینی بنانے کی کوئی تدبیر کرتا اور سکھوں اور ہندوؤں کی شاگردی تو خیر اختیار کرتا ہی لیکن جو گل مسلمانوں نے کھلائے اس کے لیے ساری دنیا کے پھول اکٹھے کر کے سب کے سب ان پر گل پاشی میں ہی ختم کر دیتا کہ اس کے بعد کوئی گل کھلنے کا تصور بھی کر پائے تو پانی کے بجائے لہو سے بجھنے والی پیاس کے نتیجہ میں ہی ایسا ممکن .....اور ہر گل صرف یہ کہہ اٹھنے پر مجبور کہ غیروں سے شکوے کی فرسودہ اور کہنہ روایات کا دریا برد کیا جانا ناگزیر اور اس سوال کا ہمیشہ قائم رہنا اٹل کہ کیا مسلمانان ہند بھی کبھی خطے کے ایک بہت بڑے ذبح خانے

میں تبدیل ہو کر رہ جانے میں اپنی تاریخی اداؤں میں پنہاں تاریکیوں پر غور کرنے کی جرأت کر پائیں گے.....!

مظفر بخاری نے اگرچہ کوئی شکوہ نہیں کیا اور اپنی رو میں لکھتے چلے گئے لیکن دل میں موجود درد اور اسی کی سب سے نچلی تہہ میں موجود ضمیر کی چیخیں قرطاس پر کچھ اس طرح اتر آئیں کہ ہر ہر ورق..... جیسے بجائے خود اک داستاں ادھوری ماتم کناں بربریت کی..... مجسم سوال کہ اگر ہندوؤں اور سکھوں نے تمہاری خواتین کی عصمتیں پامال کیں تو تم نے غیر مذاہب کی خواتین کے ساتھ بدلے کے نام پر جو سلوک کیا وہ ہمارے دین کا سکھایا ہوا تو ہرگز نہیں۔ اگرچہ یہ موضوع انتہائی روایتی اور فرسودہ ہو چکا ہے لیکن اس کے پس پردہ محرکات بھی یکطرفہ مقدمات بے دریغ پیش کیے جانے اور ایک ہی رونا روتے رہنے کا نتیجہ ہے تاہم مظفر بخاری کی سب سے بڑی خوبی جو معمولی سے معمولی مشاہدے کے حامل اذہان کو بے اختیار متوجہ کرنے میں انتہائی کامیاب رہی وہ ان کی سادہ بیانی ہے..... خواہ مخواہ الفاظ کی ثقالت انڈیلنے کی سعی دور دور تک دکھائی نہیں دیتی۔ نئی نسل حقائق سے دور ہو چکی ہے اور نہ تو اپنے آباؤ اجداد کی دی گئی حقیقی بے مثال قربانیوں اور نہ ہی ان میں موجود کچھ لوگوں کی سفاک طبیعتوں سے آشنا ہے۔ بلاشبہ مظفر بخاری کا غیر معمولی انداز ثابت کرتا ہے کہ ان کہی بات میں بھی انسانی درندگی خواہ کسی بھی آڑ میں اور بربریت کسی بھی حال میں ..... بہرحال چھپ نہیں سکتی۔ خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے کا سفر بالآخر ناتمام ہوا..... تعبیر کا مفہوم محض پنجرہ بدلنا اور صیاد کے نقاب کا اترنا کئی رنگوں کے جلاد کا حقیقی صورت سامنے آنا ثابت ہوا۔ خواب کتنا حسین کہ جس کا طلسم آج بھی روح کو اپنی طرف بے اختیار کھینچ لے لیکن تعبیر اتنی بھیانک اور تاریک جیسے اماوس کی سیاہ رات ..... اور ہر صبح کا سورج آباؤ اجداد کے خون میں نہایا ہوا سا..... جب کہ اپنے دلوں میں بھی یہ کیسا ..... کبھی نہ ڈھل پانے والا داغ داغ اجالا سا.....! اگرچہ تاریخ مکمل سچائی تو کبھی بیان کر ہی نہیں پائی لیکن انتہائی دلچسپ امر کہ..... سبھی کچھ کبھی چھپا بھی تو نہیں پائی۔ آج کی نسل کیلئے یہ سب حقیقی تناظر میں جاننا بہت ضروری ہے کہ 77 سال پہلے ہمارے آباؤ اجداد میں صرف مظلوم ہی نہیں بلکہ کچھ لوگ تاریخی لحاظ سے یاد رکھے جانے والے جلاد بھی تھے۔ مظفر بخاری نے انتہائی معصومیت اور سادگی سے بچپن کی یادداشتوں کو رقم کیا بھی تو یوں جیسے سرِ راہ چلتے چلتے یونہی کان میں کوئی سرگوشی سی کی ہو..... لیکن اس کی گونج میں جیسے انسانی ضمیر ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے نظریں چرا تا رہ گیا ہو۔

☆☆☆☆☆

فرحت عباس شاہ جسے معمولی شاعر سمجھا گیا

بیسویں صدی کے اواخر میں ایک نام تیزی سے اردو غزل میں سامنے آیا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے اردو مشاعروں میں اپنی جگہ بنائی اور ایسی بنائی کہ پھر کوئی مشاعرہ اس شاعر کے بغیر ادھورا تصور کیا جاتا تھا۔ یہ شاعر ایک معمولی شاعر سے زیادہ غیر معمولی شاعر گردانا گیا جس کی شاعری میں شاعرانہ اسرار رموز کے جملہ عناصر شعریت کا گہرا ادراک قارئین و ناقدین نے برابر محسوس کیا۔ اس شاعر کا پہلا شعری مجموعہ ''شام کے بعد'' منظر عام پر آنے سے یوں محسوس ہوا جیسے شاعری گہری نیند سے بیدار ہوگئی ہے اور اس کی انگڑائیوں میں محبت و رومانس کی تراوتوں کی پھوار خشک و تر کو جل تھل کر ڈالے گی۔

اس شاعر نے اپنے زمانہ شباب سے ہنوز اتنا لکھا ہے کہ اگر اس سرمائے کو جمع کر لیا جائے تو ایک ادارہ کی اشاعتی کتب کی مجموعی صورت اختیار کر جائے - پچاس شعری مجموعے اردو شاعری کے اور چار شعری مجموعے پنجابی شاعری کے، نیز چار تصانیف تنقیدی جہات پر لکھنے سمیت متفرق موضوعات زیست پر سیکڑوں مضامین اس شاعر کے قلم سے حلقہ ادب کو میسر نصیب ہوئے۔ یہ عجیب و غریب شخصیت فرحت عباس شاہ کی ہے جس نے اردو شاعری کو نئے امکانات سے روشناس کیا اور اردو غزل کی صنف کو محبت و رومانس کے تصور سے نکال کر سماجی شعور کے لاینحل مباحث کا ترجمان بنا ڈالا۔

محسن خالد محسن

اس شاعر کو ہم عصروں نے شدید تنقید کا نشانہ بنایا، ان کی راہ میں روڑے اٹکائے گئے اور منصوبہ بند طریقے سے ان کی شخصیت اور شاعری کو شعوری اذیت کے تختۂ دار پر مسلسل اوندھا رکھنے کی کوشش کی گئی لیکن جادو وہ جو سر چڑھ کے بولتا ہے کے مصداق اس شاعر کا جملہ کلام نظم ونثر اپنی اہمیت منوا کر رہا۔ فرحت عباس شاہ 1964 میں جھنگ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جھنگ میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے شہر لاہور چلے آئے۔

یہاں سے ایم اے فلسفہ پنجاب یونی ورسٹی سے کیا، بعد ازاں انگریزی ادبیات میں بھی ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے علاوہ معاشیات کے میدان میں تصدیقی سرٹیفکیٹ حاصل کیے۔ ملازمت کا سلسلہ مختلف انتظامی اور نجی تنظیموں سے جز وقتی وابستگی کی صورت ایک مدت تلک جاری رہا۔ پولیس کے محکمہ میں رہے، برف کے بلاک توڑنے کا واقعہ ان کی مرنجاں مرنج شخصیت کی پہلوانی تخصیص کا پتہ دیتی ہے۔ فرحت عباس شاہ کی تعلیم وتربیت اور عملی زندگی کے حوادث اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ یہ معمولی انسان اپنے اندر ایک غیر معمولی شخصیت کو چھپائے ہوئے تھا جس کا اظہار ان کی بسیار نویسی کی صورت بیسویں صدی کے اختتام اور اکیسویں صدی کے آغاز میں سامنے آیا۔

فرحت عباس شاہ نے اردو غزل کی صنف کو نئے موضوعات سے روشناس کروایا۔ انھوں نے چار طویل نظمیں (سرابی، روگ، اکیسویں صدی کی پہلی نظم، محبت کی آخری ادھوری نظم) لکھ کر اردو نظم کو ادبیات عالم کے معیار پر لا کھڑا کیا۔ پاکستانی معاشرت میں ایک قباحت بہت عام ہے اور وہ یہ کہ کسی شخص کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرنے میں ہمیشہ کیڑے نکالنا اور نک سک سے عاری سمجھتے ہوئے فنکار کے فن کو نظر انداز کرنا۔ یہ ایک ایسا زہر ناک رویہ ہے جس نے پاکستان کے سیکڑوں شعرا کو گمنام ونامراد کیا ہے۔

یہ شاعر اپنے اندر کے حساس شخص کو مارنے کی تگ ودو میں اپنوں کی بے وفائی اور بے مروتی کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لیے نابود ہو گئے۔ پاکستان میں چند سال سے اردو زبان وادب کے تخلیق کاروں، نقادوں، تجزیہ کاروں اور اساتذہ کے ہاں ایک رویے نے جنم لیا ہے اور وہ یہ کہ کسی شاعر، نقاد، محقق اور تخلیق کار کے اچھے اور معیاری کام کو سامنے نہ لانا اور اس کی کسی صورت تحسین نہ کرنا ہے۔ ہم عصر شاعر نے اچھی غزل یا نظم کہہ دی تو جل بھن جائیں

گے اور اوزان و بحور کی موشگافیوں میں شعر کی حسیت کو الجھا دیں گے۔

کسی نقاد کے ہاں کوئی نیا خیال سوجھا جس پر موصوف نے اپنا نظریہ پیش کیا اور اسے مضمون کی صورت سامنے لانے کی کوشش کی، اب اس بے چارے کی خیر نہیں، اس کے بال نوچے جائیں گے اور اس کے مجموعی کام کو رد کرنے کی ہر مذموم کوشش کی جائے گی۔ یہی حال جامعات میں اساتذہ کا ہے، کسی صاحب نے اچھا آرٹیکل لکھا یا کوئی عمدہ مضمون شائع کروالیا تو اس کی خیر نہیں، اس تحریر پر متعصب حلقوں میں ایسی ردوقد ہوگی اور اعتراض در اعتراض وارد ہوں گے کہ یہ ہتک آمیز تنقید و تنقیص سے اس قدر مایوس و ناامید ہوں گے کہ کچھ نیا کہنے اور سامنے لانے کی مدت دراز تک کوشش نہیں کریں۔

مزید ستم یہ کہ کوئی نو آموز سکالر کسی گمنام شخصیت کے کام پر مقالہ لکھنے کی کوشش کرتا ہے تو ادب کے جانشین اسے ڈانٹ پلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو بکواس شاعر تھا، اس پر کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اردو زبان و ادب کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے میں پاکستان کے بڑے شہروں لاہور، کراچی، اسلام آباد، سرگودھا، فیصل آباد، ملتان وغیرہ میں بیسویں صدی کے وسط اور اکیسویں صدی کے اوائل میں درجنوں انجمنیں اور گروپس سرگرم تھے جنھوں نے جی بھر کر ایک دوسرے کو سرقہ باز، چور، منشی، ٹی سی باز، تلوے چاٹ، کتا، کتا، ذلیل ذلیل اور بے کار بے کار کہا اور ایک دوسرے کے جملہ تخلیقی، تنقیدی، تجزیاتی، تحقیقی اور تاثراتی کام کا رد کیا۔

ان گروپس کے بانیان کے بارے میں اہل ادب جانتے ہیں، نام لوں گا تو رسوائی میری بھی ہوگی کہ میں بھی اسی کوچہ ملامت کے منہدم کھنڈروں میں گوشہ نشین ہوں۔ فرحت عباس شاہ کی شاعری اپنے عہد کے مجموعی تنزل کا سراپا احتجاج شاعری ہے۔ جس میں المیہ اور حزنیہ عناصر کی فراوانی رومانس کی نسبت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ فرحت عباس شاہ کے ہاں مذکورہ ادب کی متعصب اور مکدر و منغض تنزل آمیز صورت احوال کا عکس فرواں نظر آتا ہے۔ یہ واحد شاعر ہے جس نے کسی بڑے نمائشی اور ڈراما باز شاعر و استاد نما بونے کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے۔

اس فقیر اور درویش منش شاعر کو ہر سطح پر مطعون کیا گیا اور اس کی کردار کشی سمیت اس کے جملہ تخلیقی کام کا رد کیا گیا، اس کے باوجود اس شاعر نے خود کو منوایا اور زوروں سے منوا کر دم لیا۔ فرحت عباس شاہ کا اردو اور پنجابی کلام

اگرچہ پچپن شعری مجموعوں میں پھیلا ہوا ہے تاہم اس کلام میں موضوعات کی تکرار نہیں ہے بلکہ ہر شعری مجموعے میں ایک نئے تجربے کی واردات کا احوال ہے۔ فرحت عباس شاہ کے مجموعی کلام کو کلیات (اداسی ٹھہر جاتی ہے، یہ عجیب میری محبتیں، اداس اداس، آدھے غم اور آدھی خوشیاں، میرا شام سلونا شاہ پیا) میں یکجا کیا گیا ہے۔

فرحت عباس شاہ کی شاعرانہ حیثیت مسلم ہے جسے اب کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ فرحت عباس شاہ نے تنقید کے میدان میں ''اردو کی ادرا کی تنقید'' لکھ کر ایسی ہلچل پیدا کی ہے کہ نقادان ادب کے ہاں اس تصنیف پر مبہم اور پر پیچ سی رائے کا اظہار سامنے آیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے فرحت عباس شاہ جیسے بے مثل شاعر کو ان صاحبان نے بہت ہلکا سمجھ کر نظر انداز کر رکھا تھا اور اب ان کی تنقیدی کتاب منظر عام پر آنے سے یہ پریشان ہو گئے ہیں کہ اس بندے کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرنے کے علاوہ اور کون سا حیلہ اور حربہ تراشا جائے کہ یہ شاعر تو پورا ہے اور نقاد بھی کسی طور معمولی نہیں ہے پھر اس کی فلسفیانہ فکر کو اوج تفکر میسر ہے۔

بھیا! سیدھی سی بات ہے، ایک شاعر ایک وقت میں مفکر، فلاسفر، ادیب، نثار، محقق، مدون، مؤلف، نقاد، مترجم، کرائے باز، شعلہ ساز، سماجی کارکن، رحم دل، شفیق و ملنسار اور باغی الذہن و عادات بھی تو ہو سکتا ہے۔ کسی شخص کی ذات اور شخصیت کو اپنے متعین کیے ہوئے کھوکھلے معیار پر آنکنے کے بجائے کھلے دل سے اس کے جملہ اوصاف حمیدہ کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ فرحت عباس شاہ اکیسویں صدی کا بہترین شاعر اور کہنہ مشق نقاد ہے جس نے اردو زبان و ادب کو اپنی فکری جودت سے ایک ایسا شعری و نثری خزینہ عطا کیا ہے جس کی اہمیت اور افادیت ہمیشہ مستحکم رہے گی۔ بطور تبرک فرحت عباس شاہ کے بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ کیجیے اور لطف لیجیے:

تو نے دیکھا ہے کبھی ایک نظر شام کے بعد
کتنے چپ چاپ سے لگتے ہیں شجر شام کے بعد

.....

کبھی سحر تو کبھی شام لے گیا مجھ سے
تمہارا درد کئی کام لے گیا مجھ سے

.....

سانس لیتا ہوں تو روتا ہے کوئی سینے میں
دل دھڑکتا ہے تو ماتم کی صدا آتی ہے

.....

انا کی جنگ میں ہم جیت تو گئے لیکن
پھر اس کے بعد بہت دیر تک نڈھال رہے

☆☆☆☆☆

فیصل عرفان کی ''ہوشے'' پوٹھوہاریوں کے لیے نایاب تحفہ

اس بات میں کوئی دو رائے نہیں کہ کسی بھی خطہ کی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور قابل شخصیات جب اپنی زبان اور ثقافت کے فروغ اور تحفظ کی ٹھان لیں تو اس زبان اور ثقافت کی معدومیت کے خطرات نہ ہونے کے برابر رہ جاتے ہیں، یہ بے لوث محققین مقامی ثقافتوں اور زبانوں پر نئے انداز اور زاویوں سے کام کرتے اور دنیا بھر کو زبانوں کے مختلف شیڈز اور ذائقوں سے متعارف کراتے ہیں، ایسی شخصیات نہ صرف اپنے قبیلے بلکہ پورے خطہ کے لیے فخر اور مان کا باعث بنتی ہیں۔

خطہ پوٹھوہار کی بات کریں تو یہاں بسنے والے تین معروف نوجوان شاعر، ادیب، کالم نگار اور محققین عبدالرحمٰن واصف، فرزند علی ہاشمی اور فیصل عرفان اپنی تحقیقی اور ادبی کاوشوں کی وجہ سے ادبی اُفق پر روشن ستاروں کی مانند نمایاں ہو چکے ہیں۔ تینوں نے بہت کم وقت میں اپنے معیاری اور تحقیقی کام کا لوہا منوا لیا ہے اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ دوسری زبانوں کے محققین بھی اب ان کے تحقیقی کام کو بطور سند پیش کرنے لگ پڑے ہیں۔

ان تینوں اہم ادبی شخصیات میں سے فیصل عرفان کے علمی، ادبی اور تحقیقی سفر پر بات کی جائے تو خوشگوار حیرت کا احساس ہوتا ہے کہ کم عمری کے باوجود اتنا بڑا اور معیاری کام سامنے لانا کسی کرامت سے کم نہیں، پوٹھوہاری کتاب ''ہوشے'' کی صورت میں خطہ پوٹھوہار کے باسیوں کو انہوں نے جو خوبصورت تحفہ دیا ہے وہ قابلِ تحسین اور سراہے جانے کے لائق ہے۔ فیصل عرفان خطہ پوٹھوہار کی سرزمین میں جنم لینے والا وہ بہادر کالم نگار، محقق اور شاعر ہے جس نے پوٹھوہاری زبان کا ہر میدان میں دفاع کیا

شکور احسن

ہے، سوشل میڈیا کیساتھ ساتھ پرنٹ میڈیا پر بھی پوٹھوہار اور پوٹھوہاری زبان کے فروغ کے لیے اُن کی کاوشیں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ پوٹھوہاری زبان میں مرتب کی گئی ''ہوشے'' اُن کی تیسری نمایاں کتاب ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ زبان وادب اور تاریخ کے تحقیقی کاموں مثلاً زبان، گرائمر، روزمرہ بولے جانے والے محاوروں، پہیلیوں، گیتوں اور لوک گیتوں پر تحقیق کرنا کالجز اور جامعات کے پروفیسرز اور پی ایچ ڈی سکالرز کا کام ہے مگر فیصل عرفان نے ان شعبوں سے تعلق نہ ہونے کے باوجود بھی اپنی محنت اور لگن سے تحقیق کے کوہ ہمالیہ سر کر لیے ہیں۔ فیصل عرفان کی پہلی دو تحقیقی کتابیں ''پوٹھوہاری اکھانڑے محاورے'' اور ''پرجھات مہاڑی انھیں'' تو ادبی دنیا میں اپنا لوہا منوا ہی چکی ہیں، اب ان کی نئی کتاب ''ہوشے'' بھی اپنے انفرادی اور خوبصورت موضوع کی وجہ سے ادبی حلقوں میں زیر بحث اور پسندیدگی کی سند حاصل کر رہی کیونکہ یہ تحقیقی کتاب پوٹھوہاری لوک گیتوں، سٹھنیوں اور ان کے تاریخی پس منظر اور قدامت پر مشتمل ہے، لوک ادب کے قاری عوام وخواص دونوں ہوتے ہیں اس لیے اسکی اہمیت کسی دور میں کم ہوئی اور نہ ہی آئندہ کبھی کم ہوگی، لوک ادب کو بار بار سننے اور پڑھنے کا دل کرتا ہے۔

''ہوشے'' میں خطہ پوٹھوہار کے مختلف علاقوں میں شادی بیاہ کے موقع پر گائے جانے والے لوک گیت (گالیں) اور سٹھنیاں شامل کی گئی ہیں، ویسے تو لوک گیتوں میں محبت کے جذبات، ہجر اور وصال کی کیفیات تو مشترک ہوتی ہی ہیں مگر اس کتاب میں جو گیت جمع کیے گئے ہیں ان میں پوٹھوہار کی ثقافت، تہذیب، دکھ درد، جذبات، رہتل، اس کے ہنستے بستے دیہات، یہاں کے نظریات، رویے، خوشیاں، غم، پاؤں میں ظالم سماج کی بیڑیاں، ہاتھوں میں محبت کے گجرے، آنکھوں میں جنم لیتی خواہشات کے موتی، زیست کے رستے میں بل کھاتے موڑ، گھر کی دہلیز پہ غربت کے پالے سانپ، سوچوں کے گہرے کنوئیں، جوانی میں پیار محبت کے جذبات، آپس کی نوک جھوک، بے وفائی پہ شکوے، ہجر اور وصل کی کیفیات، دل کے نوحے، اپنوں کے غیروں جیسے سلوک کو میٹھے اور سنہری لفظوں سے سجایا اور گنگنایا جاتا ہے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ جدید ٹیکنالوجی اور معاشی ترقی نے لوک تہذیب وتمدن کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اس کے اثرات ہمارے معاشرے اور ہمارے رویوں پر اپنے نقش جما رہے ہیں، اس ترقی نے ہماری ترجیحات تبدیل کر کے رکھ دی ہیں،

خونی رشتوں میں دوریاں پیدا ہوگئی ہیں، ہر بندہ خودغرضی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے، اسی وجہ سے ہمارا حقیقی اور قدیمی کلچر، تہذیب وتمدن اور زبان تباہی کی جانب گامزن ہیں، مادری زبان کے فروغ اور بقا کی علمی اور ادبی جنگ لڑنا بہت مشکل ہو چکا ہے، لوگوں کا مسئلہ ادب اور زبان کا فروغ نہیں روٹی کپڑا اور مکان بن گیا ہے، مگر فیصل عرفان نے بہت محنت، محبت اور عرق ریزی سے بے لوث ہو کر بہت حد تک پوٹھوہاری زبان کو محفوظ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، اس کتاب کا ایک خوبصورت پہلو یہ بھی ہے کہ خطہ پوٹھوہار کے دیہات وقصبات میں پوٹھوہاری لوک گیت اور گالیں گانے والے لوک گلوکار اور ان کے معاون سازندوں کے ناموں کو بھی شامل کر کے انہیں نہ صرف خراج تحسین پیش کیا ہے بلکہ تاریخ کے اوراق میں زندہ جاوید بھی کر دیا ہے۔

کتاب کا باریک بینی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات انبساط کا باعث بنتی ہے کہ شادی بیاہ کی رسومات پر گائے جانے والے لوک گیتوں کے علاوہ متفرق لوک گیت بھی موجود ہیں، مختلف موضوعات پر لوک گیتوں کی جمع آوری نوجوان محقق فیصل عرفان کا کارنامہ ہے، شادی کے دن مقرر ہونے، مہندی، گھڑولی، دولہا بننے کے وقت کے گیت، بارات کی روانگی، دلہن کی رخصتی، ڈولی گھر لے کر آنے کے علاوہ بے شمار موضوعات پر لوک گیت موجود ہیں، یہ لوک گیت اور سٹھنیاں پڑھنے اور سننے میں بہت لطف دیتی ہیں، پوٹھوہار اور پوٹھوہاری زبان میں گیتوں کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں مقامی ثقافت کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ محبت اور بھائی چارے کے فروغ کا درس بھی ملتا ہے۔

جب بھی کوئی محقق، ادیب یا عام قاری ان لوک گیتوں کا مطالعہ کریگا تو اسے پوٹھوہار کے ماضی اور حال سے شناسائی حاصل ہوگی، ان گیتوں میں خطہ پوٹھوہار کی تہذیب وثقافت، یہاں کے باسیوں کے دکھ درد اور خوشیاں شامل ہیں، ان تمام خوبیوں کی بنا پر یہ کتاب دستاویز بن چکی ہے جو پوٹھوہار، پوٹھوہاری زبان اور فیصل عرفان کی اہمیت اور شہرت میں اضافہ کرے گی۔

فیصل عرفان نے چھوٹی عمر میں ادبی حوالے سے بڑے اہم کام کر لیے ہیں اور پوٹھوہاری زبان وادب کے لیے سنجیدہ اور اہم کردار ادا کرنے والے لوگوں میں اپنا شمار کرا چکے ہیں، ان کی کتاب ''ہوشے'' خطہ پوٹھوہار اور پوٹھوہاری زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نایاب تحفہ ہے جو فیصل عرفان اور ہمارے خطہ پوٹھوہار کی شناخت کو قائم ودائم رکھے گا۔

☆☆☆☆☆

''ستارے ہم سفر میرے'' کا شاعر

امتیاز گلیانوی کو بطور مزاح نگار تو میں جانتا تھا اور یہ بھی کہ وہ ایک نثر نگار ہونے کے ناتے سفر نامہ، کالم، افسانے اور انشائیے بھی لکھ کر اپنی پہچان بنا چکے ہیں۔ شاعری کے میدان میں ان کو کبھی کبھی ادبی رسائل کی زینت بنتے بھی دیکھا۔ اب جب کہ ان کا شعری مجموعہ ''ستارے ہم سفر میرے'' جو حال ہی میں شائع ہو کر موصول ہوا تو پڑھ کر محسوس ہوا کہ امتیاز گلیانوی شاعری میں بھی بہت جلد اپنی پہچان بنالیں گے۔

امتیازی گلیانوی کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے کہ جن کا شعری مجموعہ پڑھتے ہوئے قاری کئی اشعار پر رُکتا ہے اور دیر تک اس کا تاثر محسوس کرتا ہے ''ستارے ہم سفر میرے'' میں مجھے کئی شعر ایسے ملے جن پر مجھے یہی تاثر ملا اور ان اشعار میں کئی نویکلے موضوعات ہیں۔ اُن کے ہاں اشعار میں جو تاثر مجھے سب سے نمایاں محسوس ہوا ہے وہ سچائی کا عنصر ہے۔ شاعری میں سچائی اور بے تکلفی ہو تو ایسی شاعری عام قاری کو آسان لگتی ہے اور اس میں دلچسپی بڑھتی جاتی ہے اور سونے پر سہاگہ یہ ہے کہ غزل میں تغزل اور موسیقیت ہو تو وہ شاعری کو عروج تک لے جاتی ہے۔ یہ خوبیاں غزل کی بنیادی اور اہم خوبیوں میں سے ہیں۔ ادب کے قارئین کے علاوہ عام قارئین بھی ایسی شاعری کو پسند کرتے ہیں۔ شاعری کی کتاب پڑھتے ہوئے آپ کو اگر ایک یا دو شعر بھی یاد رہ جائیں اور کتاب کا تاثر ذہن میں بیٹھ جائے تو یہ سمجھ لیجیے کہ شاعر کی کامیابی ہے۔ ورنہ آج کے دَور میں کئی شعری مجموعے موصول ہوتے ہیں جن کو پڑھ کر ایسے شعراء کا شمار بے اثرے شاعروں میں کرنا پڑ جاتا ہے جن کے مجموعے در مجموعے تو کثیر تعداد میں آتے رہتے ہیں مگر ان میں تاثیر نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی اور مجال ہے کہ پڑھنے والے کو ان کا ایک شعر بھی یاد رہ جائے۔

امتیاز گلیانوی کی زندگی کا ابتدائی حصہ پاکستان میں خصوصی طور پر دیہی کلچر اور روایت سے جُڑے ہوئے گزرا ہے۔ ان کا یہ دور اپنے سچے اور بے لوث رشتوں اور بے تکلف دوستوں میں گزرا ہے۔ اُن کے ہاں سچائی اور بے تکلفی اُسی طرح کی ہے جو اسی روایت کے لوگوں میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اس کے بعد امتیاز گلیانوی کا دوسرا پڑاؤ دیار غیر ہے جو انگلستان جیسے ملک میں ہوا، وہاں بھی انہوں نے اپنی دھرتی سے محبت کو یاد رکھا اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے ترجمانی کرتے ہوئے اپنی

سلیم اختر

شعری اور نثری تخلیق کا حصہ بنایا۔
امتیاز گلیانوی کی چھوٹی بحروں کی غزلوں میں بڑے بڑے موضوعات ہیں۔ ان موضوعات میں جامعیت بھی ہے اور آفاقیت بھی ۔ موضوعات اگرچہ عام، قدیم اور روایتی ہیں مگر ان کا انداز منفرد ہے جس میں اشعار کے موضوعات کو پیش کرنے کا نیا انداز ہے۔
آج کے اس مادی اور تیز رفتاری کے دور میں جہاں لوگ چاند کے ہم سفر ہونے کی تمنا دل میں بسائے ہوئے ہر حربہ استعمال کر رہے ہوتے ہیں اور ہر راہ اختیار کرنے میں سرگرداں نظر آتے ہیں اور چاند کو پانے کی دوڑ میں ہیں۔ ایسے میں امتیاز گلیانوی ایک ایسی نظریاتی شخصیت ہے کہ انھوں نے ''ستارے ہم سفر میرے'' کے نظریے پر ستاروں کا ہم سفر بننے کو ترجیح دی ہے، یہ سوچ ان کی مادری تربیت کی دین ہے کہ چاند اپنی پہنچ میں ہونے کے باوجود وہ ستاروں کا ہم سفر ہونے میں فخر محسوس کرتا ہے۔

ستارے ہم سفر میرے اجالے ہم سفر میرے
مری مٹی کے رستے میں حوالے ہم سفر میرے

....

ایک تخلیق کار جہاں بھی ہو یا جس معاشرے میں زندگی بسر کر رہا ہو اس ماحول کے اثرات بالواسطہ یا بلاواسطہ اس تخلیق کار کی شخصیت پر اثر انداز ضرور ہوتے ہیں اور یہی اثرات تخلیق کار کی تخلیق کا حصہ بنتے ہیں۔ ماحول کے مثبت اثرات سے فن کار کے فکر و فن میں نکھار آتا ہے۔

معاشرتی ماحول میں پائے جانے والے اثرات بلاشبہ امتیاز گلیانوی کی شخصیت اور شاعری پر ہیں۔ برطانیہ میں گزرے ہوئے شب و روز، سرگرمیاں، انسانی رویے اور مختلف تہذیبوں کے تغیر و تبدل، زندگی کی رعنائیاں، امتیاز گلیانوی کی زندگی کا حصہ بھی بنے۔ مگر وہ میچور رویے اور حساس ذہن رکھنے والا شاعر ہے۔ وہ زندگی کی تلخیوں سے بھی آشنا ہے اور رعنائیوں سے بھی نا آشنا نہیں۔ امتیاز گلیانوی نے اپنی شاعری کا رخ کسی لالہ رُخ اور مہ رُخ کی طرف نہیں رکھا بلکہ زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو ترجیح دی، جذبے میں بھی سچائی ہے اور اظہار میں فکر کی بلندی ہے۔
امتیاز گلیانوی کے اشعار پڑھ کر قاری اپنے خوبصورت ماضی اور معصومیت کے دور میں سفر کرتا دکھائی دیتا ہے جہاں اس کے بچے اور سنہرے خواب نمو پا رہے ہوتے ہیں۔ امتیاز گلیانوی دو تہذیبوں کے ترجمان ہیں مگر ان کا زیادہ تر نکتہ نظر پاکستان کی دھرتی ،روایت اور کلچر سے وابستہ ہے۔
''ستارے ہم سفر میرے'' پر رائے دیتے ہوئے ڈاکٹر نثار ترابی لکھتے ہیں:
''ان غزلوں میں شخصی محبتوں کے وسیلے سے نمو پانے والے خیالات کی ترجمانی اپنی ذات کا کرب، عصری آشوب کا بیان اور گرد و پیش کے ماحول کا دردمندانہ احساس شامل ہے۔ مجموعی طور پر اُن کے فکری سرمائے نے جو اعتبار حاصل کیا ہے اُس نے یہ ثبوت فراہم کیا ہے کہ انسان

چاہے سات سمندر پار ہزاروں میل کی دُوری پر بھی کیوں نہ رہا ہو اگر مٹی کی بُو باس اور اس کا رس رچا ؤ اس کے تخلیقی وجدان میں شامل ہے تو اپنی تہذیبی قدروں اور اپنی زبان سے اس کا عشق سدا جوان ہی رہتا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے امتیاز گلیانوی کے حوالے سے اپنے گاؤں کی تہذیب سے لے کر برطانیہ جیسی جدید اور مہذب معاشرے کی علمبردار تہذیب تک کے سفر کا خوب احاطہ کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں امتیاز گلیانوی کی اپنی دھرتی سے جُڑت اور روایت سے وابستگی اور سادگی کی آمیزش نے ان کی شاعری کو جلا بخشی ہے۔ اس میں اس کا تخلیقی شعور اور جدتِ خیال بھی شامل ہے۔

ہم نے کب آپ سے رکھی دُوری
ہم نے کب آپ کو پکارا نہیں

.....

خواہشوں کا حساب پوچھتے ہو
اس سمندر کا تو کنارا نہیں

.....

امتیاز گلیانوی کی شاعری میں عام بول چال کا انداز ہے اور آسان الفاظ کا بے تکلفی سے استعمال کیا گیا ہے۔ وہ کبھی خود سے بات کرتے ہیں تو کبھی معاشرے سے مگر بات اپنی کرتے ہیں۔ وہ اپنی بات کو سب کی آواز کے ساتھ ملا کر کرتے ہیں جس سے قاری اُن کے شعر اپنا مکالمہ سمجھ کر پڑھتا ہے اور اس سے اپنی سوچ اور فکر کے مطابق معنی و مفہوم رتلاش کرتا ہے:

ترے معیار تک نہیں پہنچا
میں تیرے پیار تک نہیں پہنچا

قدر کیسے ہو جیت کی اس کو
جو کبھی ہار تک نہیں پہنچا

.....

تُو ہی سُنتا نہیں سلیقے سے
بات تو سرسری نہیں ہوتی

عشق کا اختیار اپنا ہے
عشق میں بے بسی نہیں ہوتی

.....

پہلے تو بضد تھے ہمیں دریا نہیں ملتا
اب ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ پیاسا نہیں ملتا

.....

امتیاز گلیانوی "ستارے ہم سفر میرے" میں بطور غزل گو نمایاں ہے، اُن کے ہاں غزل کے تمام زیر و بم ہیں اور غزل کی روایت اور جدت کی خوبیاں موجود ہیں۔ انہوں نے جو غزل کہی ہے اس میں ان کا جذبہ، محبت اور لگن شامل ہے۔ اُن کے ہاں محبت اور نفرت کے تانے بانے بھی ہیں اور زندگی کی تلخ و شیریں صداقتیں بھی۔ انہوں معاشرتی مسائل اور سماجی ناہمواریوں کی ترجمانی کی ہے، مگر ان کا لہجہ مزاحمتی نہیں ہے بلکہ وہ بھی دھیمے اور نرم لہجے میں ایسے موضوع کی تفہیم کرتے ہیں کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ امتیاز گلیانوی کی یہ روایت اور یہ رویہ ان کے گھر کی تربیت سے ہے یا مغربی

تہذیب کے مثبت پہلوؤں کو سیکھنے اور اپنانے کے عمل سے جو بھی ہوا انہوں نے اپنی روایت سے وابستگی کا اظہار کیا ہے۔

دُنیا کی تگ و دو میں بہت اُلجھے ہیں ہم لوگ
آنکھیں نہیں ملتی کبھی چہرہ نہیں ملتا

.....

دوستی کے صدقے میں دوستوں کے ہاتھوں سے
زخم وہ ملا ہے جو آج تک سِلا نہیں

.....

مجھے یقیں ہے کہ کچھ روشنی تو ہونی ہے
جلا دیا ہے ہواؤں میں اک دیا یارو

.....

امتیاز گلیانوی کی شاعری میں سادگی ہے مگر جدید فکر اور رومانوی اندازِ فکر بھی ہے۔ انہوں نے محبت کے روز مرہ اور عام موضوعات میں رومانوی اندازِ فکر دے کر اپنی غزل کو دلکش بنانے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ ایسے کئی اشعار اس مجموعے میں ملتے ہیں۔

غزل خواہ کلاسیکل ہو یا ہلکی پھلکی، جدید ہو یا روایتی اس میں رومانوی فکر شامل نہ ہو تو پھیکی پھیکی ہی رہتی ہے اور نہ ہی اس میں غزل کے حُسن کی رعنائی ہوتی ہے۔ امتیاز گلیانوی نے حُسن و عشق، پیار و محبت اور رومانی رویّوں سے غزل میں رنگ بھر دیا ہے۔ ان کی غزل میں محبت کے رنگ، ذاتی تجربے، معاشرے میں پھیلے ہوئے رومانی رویے، احساس، درد، کسک اور شکوہ بے جا بھی ہے۔

ترے ہاتھوں سے پینا چاہتا ہوں
پرانے زخم سینا چاہتا ہوں

وہ جو اک چاند تھا مری ہی سیہ راتوں کا
جا کے اُترا ہے کہاں تجھ کو بتاؤں کیسے

.....

پھولوں کی وہ راج دُلاری ہوتی تھی
تتلی مجھ کو جان سے پیاری ہوتی تھی

.....

اُس کی آواز میں محبت تھی
لوٹ آیا ہوں میں ستاروں سے

.....

آنکھ بند کر کے دیکھتے ہیں اُسے
ہم کو یہ بھی کمال آتا ہے

.....

امتیاز گلیانوی کی شاعری میں کئی خوبیاں ایسی ہے جو غزل کو عام فہم اور رواں دواں بنا دیتی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آج کے دور میں غزل کہنے والے شعرا کی فہرست میں خوبصورت اضافہ ہے۔ ان کی شاعری محض جذبات اور احساسات کی شاعری نہیں بلکہ اس کے پیچھے زندگی کے تجربات ہیں اور وسیع مطالعہ بھی۔ سچی بات ہے کہ دیر بعد ایک اچھا شعری مجموعہ پڑھنے کو ملا۔ شاعر کی شاعری میں ریاضت، شعری رچاؤ، فنی پختگی محنت اور لگن نظر آئی ہے اور کتاب کی اشاعت بھی معیاری ہے۔ کتاب کے فلیپ پر ڈاکٹر نثار ترابی، نعمان منظور اور ثاقب امام رضوی کی آراء مزین ہیں جبکہ دیباچہ محترمہ ثمینہ سید نے لکھا ہے۔ میں امتیاز گلیانوی کو "ستارے ہم سفر میرے" کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

''جو دیکھا، جو سنا، جو بیتا'' [آپا سلمیٰ اعوان]

ایک کتاب معلومات کا ایک جہان اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ سادہ، دلچسپ لیکن پختہ لب و لہجے میں پروئی تحریریں خود پر ناز کر رہی ہیں۔ ہم جیسے ادنیٰ طالب علموں نے ان شخصیات کا قرب کما لیا، محبت پا لی۔ ان کے دور میں سیکھنے، سمجھنے کا موقع مل گیا یہ اعزاز سے کم نہیں۔ آپا جی کو ہم نے اپنی ایم فل کلاس فارمن کرسچین یونیورسٹی کے سیمینار میں دعوت دی۔ آپا کے تجربات و مشاہدات کو سکون سے بیٹھ کر تفصیلی سنا، سوالات کیے گئے۔ آپا کے ذہن و دل نگر نگر کے شاہد ہیں۔ ایک پورا عہد ہے۔ خزینہ ہے جو ہم نے تلاش مارا۔ ڈاکٹر اختر شمار ہمارے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ تھے۔ (جن کو مرحوم لکھنے کی میری ہمت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمتوں کے سایے میں رکھے۔) سلمیٰ اعوان آپا کا نام سنتے ہی عقیدت سے مسکرائے اور بولے۔ ''میں بروقت پہنچ جاؤں گا'' ڈاکٹر اشفاق احمد ورک ہمارے سیمینار کلاس کے انچارج تھے۔ انھوں نے سلمیٰ آپا کو بلانے کے مشورے سے لے کے ادب و احترام سے لانے تک کا فریضہ ادا کیا۔ ہم نے پھولوں سے استقبال کیا اور آپا جانی تمکنت سے کرسی تک پہنچیں۔ براجمان ہوئیں۔ ازلی محبت بھرے انداز میں مسکراتی اور شفقت لٹاتی رہیں۔

یہ کتاب مجھے تحفے میں دی۔ پیارا سا جیولری باکس اور قہوہ کی اسٹائلش سی ڈبیہ بھی رازداری سے تھما دی۔ میں تو ان محبتوں پر نثار ہوں۔ جو اللہ کے کرم سے میرے حصے میں بے بہا آئی ہیں۔

کتاب پڑھ لی تو اب جرأت نہیں پڑ رہی تھی کہ آپا کی کتاب پر اظہار رائے کروں۔ بہت سوچنے کے بعد کتاب کے تعارف کے ساتھ حاضر ہوں۔

یہ ضخیم کتاب تین سو چھتیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اکسٹھ ابواب بنے ہوئے ہیں۔ بک کارنر نے چھاپی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک تحریر نے یادداشت میں اپنی محفوظ جگہ بنالی ہے۔

آپا نے انتساب میں ہی حیران کر دیا۔ حیرت ہی تو کہانی ہے، کھوج ہے، تسخیر ہے۔ ایک خواہش کو سلمیٰ اعوان آپا نے انتساب کیا۔

''کاش مرنے سے قبل اپنے ملک کو اس بدحالی سے نکلتے اور سربلند ہوتے دیکھ سکوں'' آمین۔

یہ خواہش تو اس ارض پاک کے ہر محبّ

ثمینہ سیّد

جناب اختر شمار، محترمہ سلمیٰ اعوان، محترمہ ثمینہ سیّد، جناب اشفاق احمد ورک

کی ہے۔ آپا نے اس کتاب میں اپنے اندیشے، تجربے، مشاہدے، وسوسے، اور فطرت کی رنگا رنگیاں رقم کی ہیں۔ تحریر کے کئی رخ رہے۔ پیش لفظ کو ''ہم صورت گر کچھ خوابوں کے'' کا نام دیا۔ تحریر کو کتھارسس کہتے ہوئے آپا نے اس امید کو زبان دی۔ کہ ''خدا کرے کوئی ایسی تحریک اٹھے۔ کچھ جنونی دیوانے ووٹ کو عزت دینے کے ساتھ کتاب کو بھی اس کی کھوئی ہوئی عزت اور عظمت کے احیا کا سلسلہ زور وشور سے شروع کریں۔''

''کتاب سے محبت کا خمیر زندگی میں گھلنا اور رچنا بہت ضروری ہے۔''

آپا نے انوکھے عنوانات کے ساتھ مضامین لکھے۔ ''سعدی یوسف کا جنت سے جو بائیڈن کے نام خط'' اس میں امریکہ کی ستم ظریفی اور نزار قبانی کی نظم نے آنکھیں نم کر دیں۔ جو آلام سے پر نوحہ ہے۔ ''پانیوں پر لکھے ہوئے نام والا جان کیٹس'' یوں لگا میں بھی آپا کی سنگت میں کیٹس میوزیم جانے کے لیے قطار میں لگی ہوئی ہوں۔ آپا لکھتی ہیں۔

''ادھر ادھر جانے کے بجائے سب سے پہلے اس کے کمرے میں جانے کی خواہش مند ہوں جہاں اس نے آخری سانسیں لیں۔''

''ایک قابل فہم ہیجان کی سی کیفیت طاری ہے کہ کبھی روم آنے اور اس زیارت گاہ کو دیکھنے کی خوش بختی کا تو کہیں تصور ہی نہ تھا۔''

یہ انکسار اور سادگی آپا نے شعار بنا لیا ہے ورنہ کون ان کے شوق سفر اور پختہ عزائم سے واقف نہیں۔ سادگی سے اپنی منزلوں کے سنگ میل متعین کرتی چلتی جا رہی ہیں۔ اللہ رب العزت سلمیٰ اعوان آپا کو بہت ہمت دے وہ اپنی خواہشات کے تمام سنگ میل سر کر سکیں۔ ان کی کوئی بھی خواہش حسرت نہ رہے۔ وہ جان کیٹس کے کمرے کے باہر تیز سانسوں سے کھڑی ہیں۔ لکھا ہے

in this room, on the
23rd of February 1821
Died John keats

آنسوؤں کو پلکوں سے نیچے نہ اترنے میں تھوڑی سی نہیں بہت کوشش کرنی پڑی ہے۔''

پیاری آپا رسائی پا کر بھی جذبات پہ قابو نہیں رکھ پائیں تو ہم تو حسرتیں لیے بیٹھے ہیں۔

جان کیٹس ایک خط میں لکھتا ہے۔ ''میں بہت

حیران ہوتا ہوں کہ آدمی مذہب کے لیے مرتے ہیں تو شہید کہلاتے ہیں۔ میں تو سچی بات ہے اس خیال اور نظریے پر ہی تھرا اٹھتا ہوں۔ میرا مذہب محبت ہے میں صرف اس کے لیے مر سکتا ہوں۔"

جان کیٹس کے بارے میں آپا نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ میں ایک مضمون میں سب دام تحریر میں نہیں لا پا رہی تو آزردہ ہوں۔ اس کتاب کا ہر ایک مضمون قابل ذکر ہے۔ ہر ایک سطر نایاب ہے۔ میں اسے کئی بار پڑھوں گی تو تشنگی شاید ہی ختم ہو۔

"جان کیٹس کے درد کے ہر لمحے کو میں شدت سے محسوس کر رہی ہوں۔" "یہ سب جو یہاں بکھرا ہوا ہے اس کے لافانی ہونے کی خواہش کا عکاس ہی تو ہے۔"

میں ایک ایک منظر میں اٹک رہی ہوں سچ پوچھیے تو آپا کے ہم قدم نگر نگر گھومنے اور منظر بن کر ان کے لفظوں میں اترنے کا مزہ ہی نرالا ہے۔ یہ سارے منظر شاید میں دیکھ ہی نہ سکوں لیکن آپا نے میری آنکھوں میں سجا دیئے ہیں۔

ڈاکٹر تھانگ منگ شنگ سے ملاقات۔ چین کے سفر کی جزئیات سمیٹتی ہوئی باتیں اور یادیں۔ قوموں کے عروج و زوال کی رمزیں۔

ڈاکٹر تھانگ کا کہنا ہے کہ "میرے حسابوں آپ کی قوم میں چند چیزوں کا فقدان ہے۔ یہ ذہین ہے مگر پتہ مار کر کام کرنے کی عادت نہیں۔ شارٹ کٹ راستوں کے متلاشی رہتے ہیں۔ راتوں رات امیر بننا چاہتے ہیں۔"

سچ ہی تو ہے آپا کے مطابق "اچھی مخلص، سمجھدار اور ایمان دار لیڈر شپ کا ہمیشہ بحران رہا۔ اگر مخلص لوگ ملے بھی تو سازشوں اور غیر جمہوری ہتھکنڈوں سے بساط سیاست ہی لپیٹ دی گئی۔"

"اک معجزہ میری زندگی کا" بہت ہی الگ رنگ کا مضمون ہے۔ آپا نے اپنے پامسٹری کے شوق اور اس شوق کے ہاتھوں تکلیف دہ سالوں کا ذکر کیا ہے۔ لکیریں واہمہ بن کر دل میں کنڈلی مار لیں تو سخت اذیت ہے۔ اپنے ہی ہاتھ میں موت کی لکیر نے زندگی اجیرن کر دی۔ دعا اور دعا ہی اس کا توڑ بنی۔ لکیروں کو بدلتے دیکھنا بھی سحر زدہ کر دینے والا امر ہے۔ میں نے خود بھی اس سے بارہا گزر کر دیکھا ہے۔ اس لیے آپا کے درد کو محسوس کر سکتی ہوں۔

"تین سال میں کانٹوں بھری صلیب پر چڑھی رہی"

اختتام میں لکھتی ہیں۔ "کہانی کا معجزاتی انجام بھی تو سنیے کہ میری وہ صاف، سیدھی، لمبی، اور شوخ سی لکیر پہلے درمیان سے ٹوٹی پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس میں فاصلہ پیدا ہوا۔ آج وہ مجھے بتاتی ہے کہ خدا دعاؤں کا سننے والا ہے اور تقدیر بدلنے پر قادر ہے۔"

"پاکستان کی خارجہ پالیسی کے ابھرتے ہوئے امکانات اور چیلنجز" اس میں دلائل سے حوالوں سے امکانات روشن کر رہی ہیں اچھے دنوں کی امید کو وقت کی اہم ضرورت گردانتی ہیں۔

"خدا جانے کسی سولہ سالہ دوشیزہ کی کانچ جیسی عفت و عصمت کی مانند ہماری نیشنل سیکیورٹی کیوں اتنی حساس اور کمزور ہے کہ بات بات پر قومی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔"

"میں کوئی پاک امریکا تعلقات کی پٹھو نہیں لیکن پاکستانی خارجہ پالیسی میں توازن ہونا نہایت اہم اور ضروری ہے۔"

میرا محسن، میرا مربی ڈاکٹر اعجاز حسن "قریشی"

میں اپنی ''اردو ڈائجسٹ سے نسبت کا تفصیلی ذکر کرتی ہیں۔ اس میں لکھنا، یہاں ملازمت کرنا، دوستیاں، محبت بھرے مراسم آج تک قائم رہنا اور ڈاکٹر رشید امجد کا قیمتی جملہ لکھتی ہیں۔ ''ناول ''تنہا'' ہی سلمیٰ اعوان کو اردو ادب میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔''

سچ ہے یہ بہت بڑا ناول ہے اور حساس ترین موضوع پر بڑے دھڑلے سے لکھی ہوئی اہم دستاویز ہے۔ پاکستان بنگلہ دیش کی تقسیم کے اندرونی اور چونکا دینے والے حقائق۔ جب میں نے یہ ناول پڑھا تب بھی میں نے کئی دن اس پر تبصرہ کرنے کے بارے میں سوچا لیکن پھر مجھے اپنا آپ طفل کتب ہی لگا۔ آج اس کتاب کے متنوع موضوعات نے ہمت بنادی کہ آپا کی محنتوں کو اپنی بساط کے مطابق خراج تحسین پیش کروں۔

''ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے، میکرون تھیوڈور کی طرح مسلم امہ کی بیداری میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت، سیاست پر گہری نظر اور بلتستان کے مسائل اور پھول شہزادی'' میں بلتستان کے عوام کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک ہونے کا احساس اجاگر کیا۔ لکھتی ہیں۔

'بلتستان، گلگت میری زندگی کے وہ خوبصورت اور جذباتی گوشے ہیں جن سے میری نوسٹلجیائی یادوں کی لام ڈوریاں بندھی ہوئی ہیں۔''

ناگورنو کراباخ کی حسین شہزادی'' میں روس اور اس سے جڑے آرمینیائی مسائل کا ذکر ہے۔ جنگ کے ہاتھوں مختلف ممالک کے لوگوں کی بے بسی اور تکلیف کا ذکر ہے۔

''صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے،''

راجندر سنگھ بیدی کے آخری ماہ و سال خالص ادبی رنگ کے نہایت عمدہ اور معلوماتی مضامین ہیں۔ اگلے مضمون میں موٹروے پر ہونے والے ریپ کے کئی اینگل، لوگوں کی آرا اور فتوے بیان کرتے ہوئے آپا کی طبیعت کا پتہ چلتا ہے کہ ان کی ہر خبر پر نظر ہے۔ گہرائی سے رویوں کو پرکھتی ہیں، شفقت سے زخموں پر پھاہے رکھتی ہیں۔ زندہ قوموں کے چلن سکھاتی ہیں۔ نصیحت کو روایت سے ہٹ کر اپنا لینے کی اہمیت کا احساس دلاتی ہیں۔ مجبور نہیں کرتیں۔ اپنی ایک مضبوط رائے اور نقطہ نظر کی قائل ہے۔ خودداری اور انا کے ساتھ شاہراہ حیات پر رواں دواں آپا کا سفر ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ ہماری ہمت کبھی ٹوٹنے نہیں دے گا۔ سلمیٰ اعوان آپا نے اس کتاب میں مذہب، فلسفہ، سیاست، آثار قدیمہ، طلسمی کہانیوں اور ہر زندہ موضوع، ہر ممکنہ موضوع پر لکھا ہے۔ یہ کتاب بہت ساری کتابیں پڑھ لینے جتنا سکون اور تشفی دیتی ہے۔ سلمیٰ اعوان ایک ایسی عورت کا نام ہے جس کے قدموں نے زندگی کو مسخر کیا ہے۔ اپنے ہر قدم کی داستان رقم کی ہے۔ طبیعت کے اضطراب نے زندگی کو مقصد دیا ہے۔ جس کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں۔ آئندہ نسلیں بھی اس علم و جستجو کے سمندر سے سیراب ہوتی رہیں گی۔ آپا نے افسانہ، ناول، سفرنامے، حالات حاضرہ اور تبصرے پر بہتی کتابیں اور کالم لکھے۔ ابھی تک تازہ دم ہیں۔ خوب اچھا لکھ رہی ہیں ماشاء اللہ۔ آپا جانی کے لیے صحت و سلامتی کی دعائیں۔

☆☆☆☆☆

بیاء جی ..... باکمال شاعرہ

یوں تو نسائی ادب میں خواتین لکھاریوں نے اپنے اسلوب کے اعتبار سے نہ صرف اپنی شناخت بنائی بلکہ اِس شناخت کو مقامی اور بین الاقوامی سطح پر بھی روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا اور یوں اپنے تخلیقی جوہر کو مزید نمایاں کیا۔ بعض خواتین لکھاریوں اور اُن کے تخلیقی کام کو عوامی سطح پر اتنی پذیرائی ملی کہ شہرت کی دیوی اُن پر مہربان ہوئی تو ہوتی چلی گئی۔

80 کی دہائی میں جہاں شعر و ادب میں بیاء جی (نغمانہ خورشید) کا نام اپنے تخلیقی کام کی وجہ سے لاہور کے ادبی حلقوں کو گونجنے لگا وہاں اہل ذوق احباب نے بیاء جی کے تخلیقی کام کو خوب پذیرائی بخشی لیکن اپنے خاندانی مسائل کی وجہ سے ادبی حلقوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ لیکن اِس دوران اپنے اندر موجود تخلیقی جوہر کو ختم نہیں ہونے دیا بلکہ اِس خود ساختہ ''کنارہ کشی'' کے دوران شعر وادب سے وابستہ رہیں۔ بیشتر کلام پنجاب شاعری پر محیط ہے اور اِن کی شاعری میں عصری مسائل کے علاوہ تصوف کا رنگ بھی جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ بیاء جی کی شاعری خوبصورت جذبات کی شدت سے بھرپور شاعری ہے جو اُن کو اپنی دیگر ہم اثر شاعرات میں منفرد حیثیت و مقام سے سرفراز کرتی ہے۔ اُن کا اسلوب بیان اِس قدر متاثر کن ہے کہ قاری کو تادیر اپنی گرفت میں لیے رکھتا ہے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بیاء جی حوصلہ مند شاعرہ ہیں جنھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے ذات کے قرب کا بیان دلچسپ انداز میں تخلیق کیا ہے اُنھوں نے خود بھی زندگی میں پیش آنے والے مسائل، دکھوں، تکلیفوں، ناہمواریوں، رکاوٹوں کا ذکر اپنی شاعری میں بیان کیا ہے، جدت کے ساتھ ساتھ روایت کے دامن کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ بیاء جی کی شاعری سماجی شعور، عصری مسائل اور سب سے بڑھ کر محبت بل کہ بے غرض رفاقت و محبت کو اپنا موضوع بنایا ہے اِس شاعری میں قاری کو انسانی نفسیات سے جڑے جذبات سے پالا پڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ پھر ہجر ہو یا وصال، محبت ہو کہ نفرت ایک اندیکھی تڑپ بیاء جی کی شاعری میں محسوس کی جاسکتی ہے۔

بیاء جی کی شاعری جدت اور روایت کے ساتھ جڑی دکھائی دیتی ہے اور یہی وصف بیاء جی کو ممتاز شاعرہ بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ بیاء جی کبھی شہرت کے لیے بے چین دکھائی نہیں دی او رنہ ہی کبھی تخلیقی کام کے لیے سرکاری اداروں سے داد و تحسین کی منتظر رہیں اور نہ ہی تمغے سجانے کے لیے عوامی روابط کا سہارا لیا اور اپنے چالیس سالہ ادبی سفر کے دوران اِن سرکاری، درباری بیساکھیوں کا کبھی استعمال نہ کیا، لیکن دوسری طرف بیاء جی کی فن و شخصیت سے مداحین کی اچھی خاصی تعداد اُن کی پذیرائی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ بیاء جی کے مداحین پاکستان اور بیرون پاکستان بیاء جی کے فن و شخصیت کے حوالے سے بہت سی تقریبات

افتخار شوکت

منعقد کی اور ان کو اعزازات سے نوازا۔ بیاء جی نہ جہاں شاعری اور نثر میں اپنے فنی کمالات کا اظہار کیا وہاں ایک اور جہت میں بھی اپنی جداگانہ شناخت بنائی۔ بیاء جی نے ''تھریڈ پینٹنگ'' یعنی مختلف رنگ کے دھاگوں سے انتہائی محنت و جانفشانی اور باریک بینی سے کمال شاہکار تخلیق کیے ان فن پاروں کی نمائش الحمرا لاہور میں دو بار کی گئی، جہاں اس فن کے مداحوں نے اسے خوب سراہا۔ فن پاروں کی نمائش کا سلسلہ بیرون ملک بھی جاری رہا جہاں بیاء جی کے اس منفرد کام کو بھی سراہا گیا۔ اور ان فن پاروں کو تخلیق کرنے پر اُن کو مختلف اعزازات سے بھی نوازا گیا جن میں (1) ایوارڈ کاروانِ ادب رائٹر ایسوسی ایشن آف مانچسٹر یو کے 2023 (2) فاطمہ جناح ایوارڈ 2019 (3) نشان سپاس روش ویلفیئر ٹرسٹ انٹرنیشنل 2017 (4) بیسٹ پرفارمنس ایوارڈ فیڈرل کونسل آف کالمسٹ 2017، (5) بہترین لکھاری ایوارڈ حلقہ ارباب ذوق ملتان 2016 (6) بہترین لکھاری ایوارڈ بزنس کونسل اینڈ آئی ایس پی آر گورنمنٹ پنجاب 2015 (7) بہترین لکھاری ایوارڈ ریڈیو پاکستان ملتان 2015۔

بیاء جی کا تحقیقی سفر اور ان کی تحقیقی کائنات درج ذیل کتب پر محیط ہے:۔

1- اسیرِ عشق
2- فرارِ عشق
3- عشق باطن
4- لہو لہو کربلا
5- عشق وصال
6- عشق وے گنجل
7- اپنے تو ڈر لگدا
8- شاہ نامہ آئمہ کرام
9- حقوق و فرائض
10- نقش چہاردہ معصومین
11- راہ ہدایت
12- عشق دی کلی

بیاء جی نے اپنے ادبی سفر کے دوران ''پنجابی ویہڑا'' ادبی تنظیم کی بنیاد رکھی اور پنجابی ویہڑا کے زیر اہتمام سینکڑوں ادبی تقاریب مشاعروں نشستوں کا اہتمام کیا، شعر و ادب سے تعلق رکھنے والے احباب کے اعزاز میں تقاریب منعقد کی جاتی رہیں، یوں پنجابی ویہڑا ادبی خدمت میں اپنا حصہ ڈالتا نظر آتا رہا اور تا حال اہل قلم احباب کی عزت و توقیر بڑھانے اور پذیرائی کرنے میں اپنے کردار ادا کرتا رہا ہے اسی بناء پر پنجابی ویہڑا کو ملکی و غیر ملکی سطح پر غیر معمولی ادبی خدمات کی شناخت حاصل ہوئی جس کا سہرا بیاء کے سر جاتا ہے۔

یوں تو بیاء جی کو نجی ادبی و سماجی تنظیموں کی جانب سے اُن کے ادبی خدمات کے اعتراف میں اعزازات دیے جاتے رہے ہیں ایسے میں اُمید کی جاسکتی ہے کہ پاکستان کے سرکاری ادارے بھی بیاء جی ادبی خدمات کے اعتراف میں سرکاری اعزاز عطا کرنے میں بخیلی سے کام نہیں لیں گے اور ہم جلدی خبر سُن پائیں گے کہ بیاء کے علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں صدر پاکستان نے اُن کو اعزاز سے نوازا ہے۔ بلا شبہ بیاء جی اس اعزاز کے قابل بہترین انتخاب ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

☆☆☆☆☆

''حمد کے سات رنگ''..... شاعر علی شاعر کا تاریخی کارنامہ

معروف شاعر، ادیب، نقاد، صحافی، افسانہ و ناول نگار اور پبلشرز جناب شاعر علی شاعر کی مسلسل تخلیقاتِ شعری و نثری زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر آ رہی ہیں جو دنیائے اُردو ادب کو نہ صرف چونکا رہی ہیں بلکہ شاعر علی شاعر کے مقام اور نام کے گراف کو بڑھا بھی رہی ہیں۔ وہ ایک کثیر التصانیف اور کثیر الجہات شخص و شاعر ہیں جنھوں نے اب تک تمام اصنافِ نظم و نثر پر نہ صرف طبع آزمائی کی ہے بلکہ اُنھیں کتابی شکل میں بھی محفوظ کر دیا ہے۔

میرے پیشِ نظر اُن کی ایک اور شعری کاوش ''حمد کے سات رنگ'' ہے جس میں اُنھوں نے سات اصنافِ نظم ''ہائیکو، ماہیا، ثلاثی، ترویحی، دوہا، رباعی اور قطعہ'' میں سو سو حمدیہ نظمیں کہی ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ سات اصنافِ نظم پر سات سو (۷۰۰) حمدیہ نظمیں اِس کتاب میں یکجا کر دی گئی ہیں۔ اِس قسم کا انتخاب آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ شاعر علی شاعر ہی کا خاصا ہے کہ وہ ہر صنفِ سخن پر دست رس رکھتے ہیں اور اُسے بہت عمدگی سے نبھاتے بھی ہیں۔ اِس کتاب میں شامل سات سو (۷۰۰) حمدیہ نظمیں لکھنا ایک ریکارڈ ہے جس سے دامنِ اُردو ادب مالا مال ہوا ہے اور یہ وقیع سرمایۂ ادب اِن شاء اللہ تاریخ اُردو ادب کا حصہ بھی بنے گا۔

اِس کتاب کا مقدمہ پاکستان کے معروف اور حمد و نعت کے نمائندہ نقاد و شاعر اور ماہرِ اقبالیات جناب ڈاکٹر عزیز احسن نے لکھا ہے، ملاحظہ ہو۔ اِس مقدمے سے کتاب

صدام ساگر

اور صاحبِ کتاب کا بھرپور تعارف سامنے آتا ہے:

''حمد کے سات رنگ''.....

تخلیقی، فکری اور ایمانیاتی حمدیہ دھنک رنگ!

اللہ تعالیٰ نے سات زمینیں اور سات آسمان بنائے۔

الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًاo

(الملک ۶۷، آیت ۳)

(وہ اللہ جس نے) بنائے سات آسمان تہ بہ تہ۔

ہمارے ہاں ایک محاورہ بولا جاتا ہے ''چودہ طبق'' یعنی سات طبقے زمین کے اور سات طبقے آسمان کے [کائنات]۔

اسی سے ایک محاورہ بنا..... چودہ طبق روشن ہونا..... بصیرت پیدا ہونا، عقل و فراست بڑھ جانا، روشن ضمیر ہونا۔

غالب نے کہا:

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اور آتش نے کہا:

آنکھوں کو کھول اگر تو دیدار کا ہے بھوکا
چودہ طبق سے باہر نعمت نہیں ہے کوئی

.....

عجیب بات کہ سات کا عدد ہمارے عبادتی مناسک میں بھی بہت آتا ہے۔ طوافِ کعبہ کے سات چکر ہوتے ہیں۔ اسی طرح سعی کرتے وقت، حج اور عمرہ کرنے والوں کو صفا اور مروہ کے درمیان سات چکر لگانے ہوتے ہیں۔ نماز میں لازمی طور سے پڑھی جانے والی آیات بھی سات ہیں..... سورۂ فاتحہ۔ ان آیات کو سبع (سات) مثانی (دہرائی جانے والی)..... حدیث میں اس سورۃ کا نام ''سبع مثانی'' آیا ہے۔ کیوں کہ یہ سات آیات بار بار دہرائی جاتی ہیں۔

قوسِ قزح کی تجسیم بھی اسی وقت ہوتی ہے جب آفتاب کی شعاعیں بارش کے قطروں سے گزرنے کے بعد پھٹ کر سات رنگوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔

آسمانِ دنیا پر شمالی جانب سات ستارے ہیں جنھیں ''بنات النعش'' (اُردو میں سات سہیلیوں کا جھمکا) کہا جاتا ہے۔

غالب نے ان ستاروں کے جھرمٹ کا ذکر اس طرح کیا ہے:

تھیں بنات النعشِ گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

.....

مجھے نہیں معلوم کہ شاعر علی شاعر نے اپنی کتاب کا نام ''حمد کے سات رنگ''، عدد کی اہمیت کے لحاظ سے رکھا ہے یا کائنات کے نظام میں سات کے عدد کی تکرار کے خیال سے، لیکن ایک بات واضح ہے کہ موصوف نے اس عدد کے باطنی اثرات کا تصور باندھ کر ہی اپنی حمدیہ شاعری کے لیے بیسیوں اصنافِ سخن میں سے صرف سات کا انتخاب کیا ہے۔ یہ

انتخاب بھی شاعر کی اُفتادِ طبع کی نشاندہی کررہا ہے۔اس کتاب میں [۱]حمدیہ قطعات۔[۲]حمدیہ رباعیات۔[۳]حمدیہ ہائیکو۔ [۴]حمدیہ ماہیے۔[۵]حمدیہ ترویئی۔[۶]حمدیہ دوہے۔اور[۷]حمدیہ ثلاثی..... ہیں۔

یہ تمام کلام حمدیہ آہنگ لیے ہوئے ہے۔ اس کتاب میں سات اصناف کا چناؤ دیکھ کر، قرآن کی اس آیت کی طرف دھیان جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے:

یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔(التغابن۔۶۴، آیت ۱)

(اللہ ہی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں)

یعنی کائنات کے سات سات طبق (چودہ طبق) مسلسل اپنے خالق کی تسبیح میں مشغول ہیں۔

یہ محض انسان ہے جو تسبیح کرنے یا نہ کرنے کے اختیار کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا۝ (الدّھر ۷۶، آیت ۳)

(ہم نے اس [انسان] کو راہ سجھادی۔چاہے وہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا)

اُردو ادب کی تاریخ میں ایک طویل عرصے تک تقدیسی شاعری کو ادبِ عالیہ کا حصہ نہیں مانا گیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی شاعری میں جن لوگوں نے طبع آزمائی کی وہ زیادہ تر بیانیہ (Narrative) شاعری کرتے رہے، جس میں ادبی حُسن ذرا کم کم ہوتا ہے۔لیکن جب اُردو ادب کے دامن میں حمد و نعت و منقبت کے اظہاریے میں تنوع آنا شروع ہوا تو شعرا نے، متن کی تقدیسی شان کا لحاظ رکھتے ہوئے فنی اظہاریے کو بھی شعری معیارات سے ثروت مند کرنے کی اہمیت جانی۔ ''حمد کے سات رنگ'' اس اعتبار سے لائقِ تحسین تحمیدی نقش ہے کہ اس میں متن کی بُنت میں شعری لطافت اور فنی لوازم کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ شاعر نے، کتاب میں شامل ہر صنفِ شعر کے فنی لوازم کا نثر میں اظہار کردیا ہے۔ جہاں شاعر نے کسی نئی شعری صنف کو متعارف کروایا ہے، اس کے خدوخال سے آگاہی دینے کی خاطر اس کے فنی دروبست کی جانکاری دینے کا اہتمام بھی کردیا ہے۔ مثلاً

ہائیکو کے متعلق لکھتے ہیں:

''میں نے پانچ سات پانچ کی پیروی کرتے ہوئے سو(۱۰۰) ہائیکو تخلیق کیے ہیں۔''

شاعر نے، گو پانچ سات پانچ کی وضاحت نہیں کی لیکن ان کے کلام کی تقطیع کرنے سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ان کی لکھی ہائیکو فعلن فعلن فع..... فعلن

فعلن فعلن فع ..... فعلن فعلن فع .....
کے وزن پر ہیں۔
حمد یہ ماہیے کے ذیل میں لکھتے ہیں:
''چراغ حسن حسرت نے اِس [ماہیے] کی بحر، وزن اور شکل مخصوص کر دی ہے۔ اُن کا مشہور اُردو ماہیا:

باغوں میں پڑے جھولے
تم بھول گئے ہم کو
ہم تم کو نہیں بھولے

ہے، جس کے ارکان مفعول مفاعیلن ہیں۔ میں نے بھی انہی اراکین کی پیروی کرتے ہوئے سو (۱۰۰) اُردو حمد یہ ماہیے تخلیق کیے ہیں۔''
حمد یہ ترویٰنی کے ضمن میں رقم طراز ہیں:
''جناب گلزار نے ایک نئی صنفِ سخن اختراع کی تھی، جسے اُنھوں نے ترویٰنی کا نام دیا۔ تقسیم ہندوستان کے وقت وہ ہندوستان ہجرت کر گئے اور یہ صنفِ سخن پرورش نہ پا سکی..... ایک مدت گزر جانے کے بعد راقم نے اِس نئی صنفِ سخن کی طرف توجہ کی اور راقم کی ترویٰنیوں کا پہلا مجموعہ ''ترویٰنیاں'' کے نام سے ۲۰۰۹ میں شائع ہوا جس سے اِس پژمردہ صنف کو نئی زندگی بھی ملی اور اِس مجموعے کو عالمی سطح پر اوّلین کا اعزاز بھی ملا۔ ترویٰنیاں کا مقدمہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے تحریر کرتے ہوئے لکھا تھا:
''شاعر علی شاعر نے ترویٰنی پر اِس قدر کام کر دیا ہے کہ اب شاعر علی شاعر کو ترویٰنی کی نہیں بلکہ ترویٰنی کو شاعر علی شاعر کی ضرورت ہے۔''
ہائیکو، ماہیے اور ترویٰنی کے ساتھ ساتھ شاعر نے ''ثلاثی'' کا بھی تخلیقی لوازمہ پیش کیا ہے۔ یہ صنف بھی نسبتاً نئی ہے جس کو پاکستان میں حمایت علی شاعر نے متعارف کروایا تھا۔
ہائیکو، ماہیے، ترویٰنی اور ثلاثی جیسی جدید اصناف کے تعارف کے بعد شاعر نے اپنی تخلیقی کاوشوں میں کیے جانے والے تجربات کا عملی مظاہرہ بھی کر دیا ہے۔ یقیناً وہ اپنے اِن تجربات اور تخلیقی اظہارات میں کامیاب رہے ہیں۔
روایتی اصناف میں، قطعہ، رباعی اور دوہے، ہیں۔ ان میں بھی شاعر علی شاعر نے حمد یہ متون کی لمعات بکھیری ہیں۔
قطعات کی ابتدا، اللہ تعالیٰ کے نور کی ہر شے میں جلوہ گری کے مضمون سے ہوتی ہے:

اُس کے جلوے ہر طرف پھیلے ہوئے
نور اُس کا ہر کرن میں ہے نہاں

.....

یہاں معاً آیتِ قرآنی کی طرف دھیان جاتا ہے جس میں اللہ رب العزت نے خود فرمایا ہے کہ:

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (النور ۲۴، آیت ۳۵)

اللہ کی ہستی آسمان اور زمین کی

روشنی [نور] ہے۔
پہلے دو مصرعوں میں اللہ تعالیٰ کی ہر شے میں جلوہ گری کا ذکر کر کے شاعر نے دوسرے دو مصرعوں میں معرفت کا نکتہ بیان کیا ہے۔ اللہ کی جلوہ گری، اُس کی موجودگی اور اُس کی عظمت وشان دیکھنے، سمجھنے، جاننے اور قبول کرنے کے لیے بھی ''دیکھنے والی آنکھ'' درکار ہے۔ یہ گویا دعوتِ فکر ہے:

دیکھنے والی ہو شاعر آنکھ اگر
اُس کا جلوہ ہے ہر اک شے سے عیاں

....

عظمتِ رب العالمین تسلیم کرنے کے بعد، انسان کی اَنا مٹ جانی چاہیے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ انسان دنیاوی طاقت، اقتدار، حکومت اور سلطنت حاصل کرنے کے بعد بھی عاجزی کو اپنائے۔ ہاں جس نے اپنی حقیقت جان لی کہ وہ فانی ہے اور اسے ایک دن اللہ کے حضور پیش ہونا ہے، وہ کبھی فرعونیت کی راہ نہیں اپناتا۔ شاعر اسی نکتے کو شعری پیکر دیتا ہے:

مٹ گئے فرعون بھی ، ہامان بھی
اپنی طاقت پر نہ تُو مغرور ہو

....

قادرِ مطلق خدا کو مان لے
تاکہ تیری روح بھی مسرور ہو

....

قطعات کے باب میں عظمتِ ربِ ذوالجلال، اُس کی جلوہ گری، اُس سے ہی دنیا میں ہر چیز طلب کرنے کی دعوت اور مظاہرِ کائنات میں اُس کے بنائے ہوئے قوانینِ فطرت کی شعری تصویریں ہیں۔ کعبہ دیکھنے کی تمنا اور اُسی کے آگے سرخم کرنے کی آرزو ضوریز ہے۔
رُباعیات میں بھی اللہ تعالیٰ کی شانیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو:

چلتے ہیں جو دنیا میں نظام اُس کے ہیں
یہ وادی و پربت بھی تمام اُس کے ہیں

جس جس سے پکاروگے ندا آئے گی
سب نام اُسی کے ہیں، کلام اُس کے ہیں

....

حمدیہ ہائیکو بھی اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کے اعتراف کی حامل ہیں۔ دیکھیے کس سادگی سے اللہ کی بڑائی کا اظہار ہوا ہے:

خالق سچا ہے
اُس کے جیسا کوئی نہیں
سب سے اچھا ہے

پھر شاعر اپنی بخشش کی آرزو کو شعری پیکر دیتے ہوئے ''غفران'' طلبی کا نقش قائم کرتا ہے:

تُو ہی ہے رحمٰن
بخشش تجھ سے مانگوں میں
بخش مجھے غفران

اللہ تعالیٰ ہی عزت وذلت دینے پر قادر

ہے- یہ بات اس نے واضح انداز میں بتادی ہے:

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ-(اٰلِ عمران ۳، آیت ۲۶)

([اللہ!] تُو جسے چاہتا ہے عزت دیتا اور جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے)

اِس مفہوم کو ایک ہائیکو میں اِس طرح سمویا ہے:

تُو ہی ذلت دے
جس کو چاہے مرضی ہے
جتنی عزت دے

وہ جو اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ انسان چاہے شکر گزار بنے چاہے کفر کرے، تو انسان کی عظمت اس میں ہے کہ وہ کائنات کی ہر شے کی طرح اللہ رب العزت کی تعریف و ثنا ہی کرتا رہے- ایک ہائیکو ملاحظہ ہو جو کائنات کے مظاہر سے سبق حاصل کرنے کے بعد شاعر کو اللہ کی حمد و ثنا کرنے کی طرف مائل کرتی ہے:

کیوں نہ کروں میں بھی
صحرا، دریا کرتا ہے
حمد و ثنا تیری

کہیں کہیں شاعر نے اپنی قلبی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے کسی قرآنی آیت کا معنوی عکس اُتار دیا ہے- مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ-(الرعد ۱۳، آیت ۲۸)

(اور یاد رکھو کہ یہ اللہ کا ذکر ہی ہے جس سے دلوں کو چین اور قرار ملتا ہے)

(اور شک و شبہ اور خوف و غم کے سارے کانٹے نکل جاتے ہیں..... نور المبین)

اِس قرآنی آیت کے، انسانی ذہن و دل پر اثرات کا ذکر اس طرح شعری پیکر میں ڈھلا ہے:

ملتا ہے آرام
جاگوں میں یا سو جاؤں
لے کر تیرا نام

حمدیہ ماہیے میں جو کومل پن اور لطافتِ اظہار ہے اس کی داد نہ دینا بے داد ہوگی- ذرا یہ چند ماہیے ملاحظہ ہوں:

لاریب وہ اعلیٰ ہے
دنیا کا جو حاکم ہے
اللہ تعالیٰ ہے

☆

اللہ عطا کر دے
جو کچھ بھی لکھے شاعر
تُو اُس کو ثنا کر دے

☆

موجوں کو جوانی دی
ہر جھیل، سمندر کو
پُر جوش روانی دی

☆

اقرار کیا میں نے
مولا کے سوا سب کا
انکار کیا میں ہے

☆

سنتا ہے دعائیں تُو
بس نام دوا کا ہے
دیتا ہے شفائیں تُو

ان ماہیوں میں بیان کی لطافت اور اظہار کی صباحت کے ساتھ ساتھ فکری نظافت بھی محسوس ہوتی ہے۔

حمدیہ ترویٰنی کی تخلیقی جہت میں تو شاعر علی شاعر نے اپنی اوّلیت کا ڈنکا ہی بجا دیا ہے۔ اِس صنف میں شاعر نے بہت معصومانہ انداز سے اللہ کو پکارا ہے:

چڑیا چوں چوں کرتی ہے اور
کوئل کی بولی میں تو ہے
تیرا نام ہی جپتے ہیں سب

☆

رحمت کا وہ ساگر ایسا
جس کا نہیں ہے کوئی کنارہ
ہم ٹھہرے قطرے کی صورت

☆

وہ یکتا ہے، وہ تنہا ہے
کوئی نہیں ہے اُس کا ثانی
وہ ہے اکیلا حاکم سب کا

ان تمام ترویٰنیوں میں رب کی رفعت و عظمت اور یکتائی کا خوبصورت اظہار ہوگیا۔ اب ایک سبق آموز ترویٰنی دیکھیے:

آدھی رات کو اُٹھ کر شاعر
رب کو سجدہ کرتا ہے جو
اُس کا رزق بڑھاتا ہے رب

حمدیہ دوہے میں ہندی زبان کی چاشنی اور لحن و آہنگ رچا ہوا ہوتا ہے۔ شاعر علی شاعر نے جمیل الدین عالی کے مقرر کردہ اوزان میں دوہے کہے ہیں اور خوب کہے ہیں۔ حمدیہ متن کی دھنک دیکھنے کے لیے چند دوہے ملاحظہ ہوں:

ہر ہر عالم کا مالک ہے اُس کا ہے سب شور
چڑیا، تتلی، بلبل، جگنو، اُس کا ذاکر مور

☆

دل میں پھیلے مایوسی تو لگتی ہر شے ماند
اُس کے نام کی جوت جگے تو چمکے لاکھوں چاند

☆

ہم ہیں سارے کٹھ پتلی سے، ہاتھ میں اس کے ڈور
یہ بھی اچھا ہے وہ ہم کو کھینچے اپنی اَور

☆

رب کی قدرت اِن باتوں سے ناپ سکے تو ناپ
پانی خود سے برف بنا ہے اور نہ خود سے بھاپ

.....

حمدیہ ثلاثی میں شاعر علی شاعر نے حمایت علی شاعر کی پیروی کرتے ہوئے ایک ہی بحر یعنی فعلن فعلن فعلن فعلن، میں ثلاثی لکھی ہیں:

میں نے رب کی مانیں باتیں
راہ دکھائیں مجھ کو تارے
روشن ہوگئیں میری راتیں

اس ثلاثی میں ''تاروں'' سے راہ یاب ہونے کی بات کی گئی ہے۔ یہ مضمون قرآنِ کریم میں اس طرح بیان ہوا ہے:

وَعَلٰمٰتٍ ۭ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝
(النحل ۱۶، آیت ۱۶)
(اور دیکھو! اس نے [قطع مسافت کے لیے طرح طرح کی] علامتیں [نشانیاں] پیدا کر دیں اور ستاروں سے لوگ رہنمائی پاتے ہیں......نور المبین)

مزید برآں، حضورؐ اکرم نے اپنے اصحاب رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے لیے فرمایا:

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم......

(میرے صحابہؓ ستاروں کی طرح ہیں جس کی پیروی کرو گے، ہدایت یاب ہو جاؤ گے)

یہاں شاعر نے رب کی باتیں مانتے ہوئے، نبی علیہ السلام کی راہنمائی میں راہ یاب ہونے کی صورت میں ستاروں کا تذکرہ کر کے، اپنے راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کا اعلان بھی کر دیا اور ایک حقیقت سے پردہ بھی اُٹھا دیا کہ ستاروں کی راہ نمائی میں جس طرح دنیاوی راستے تلاش کیے جا سکتے ہیں، اسی طرح حضورؐ کے فدائیوں میں پہلی جماعت، اصحابؓ رسولؐ کی طرف دیکھنے سے دینی راہوں پر چلنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ یہ ثلاثی، معنویت سے لبریز ہے۔

شاعر علی شاعر نے ثلاثی میں عہد الست کی طرف بھی توجہ مبذول کروائی ہے:

کس دنیا میں رہتے ہو تم
رب سے تمھارا ناتا کیا ہے
اپنا وعدہ یاد کرو تم

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں عہد الست کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۔ (الاعراف ۷، آیت ۱۷۲)

([ازل میں رب تعالیٰ نے، جب بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا، تو سوال کیا تھا] کیا میں تمھارا پروردگار نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا تھا ہاں، تو ہی ہمارا پروردگار ہے......نور المبین)

اگر انسان کو عہد الست یاد رہے تو ممکن ہی نہیں کہ وہ رب تعالیٰ کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرے یا اس کی مخلوق کے حقوق کا خیال نہ رکھے!

اس طرح شاعر علی شاعر نے حمدیہ شاعری میں اصناف کی دھنک کے سات رنگ دکھاتے ہوئے اپنے فکری میلانات، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور عظمتِ رب العالمین کے بیان کے ساتھ ساتھ رب سے ناتا جوڑنے کی دعوت بھی دے دی ہے۔

یہ ہیں ''حمد کے سات رنگ'' جو اپنی شعری لطافت اور اظہاری تنوع کے آئینہ دار ہیں۔ میں شاعر علی شاعر کو اس تخلیقی کاوش پر مبارک باد دیتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

صاحب کی شاعرہ.....

پروین سجل ہمارے عہد کی معروف اور خوبصورت لہجے کی شاعرہ ہیں۔ان کا شعر کہنے کا انداز قدرے مختلف اور جاندار ہے۔ سجل اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شعر کہتی ہیں۔حال ہی میں ان کا شعری مجموعہ،صاحب منظر عام پر آیا ہے۔اس سے پہلے ان کے گیارہ شعری مجموعے شائع ہو کر شہرت حاصل کر چکے ہیں ۔صاحب کی شاعری بھی ان کے پہلے شائع شدہ شعری مجموعوں کی طرح صوفیانہ رنگ لئے ہوئے ہے۔روحانیت کی خوشبو سے سرشار یہ شعری مجموعہ عام روش سے ہٹ کر ہے۔بقول جناب نذیر قیصر، پروین کی شاعری مذہب کے ذکر کی شاعری نہیں،روحانی قدروں کی شاعری ہے جس کی نمود انسانی قدروں کی کونپلوں میں جھلملاتی ہے،،

پروین سجل صوفی منش شاعرہ ہیں۔صاحب کا نام اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے۔ ہماری پروین سجل صاحبہ نے بھی اسے تہہ در تہہ کئی معنوں میں برتا ہے۔تاہم میں اسے محض اتفاق ہی سمجھتا ہوں کہ اس نام سے دو شعری مجموعے پہلے بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ سجل نے یہ نام اپنی طویل غزل سے لیا ہے۔جس کا ہر شعر خوبصورت ہے۔ملاحظہ کریں----

کیا مجال آپ سے میں منہ پھیروں
جس طرح آپ کی مرضی صاحب

حسن منت کے ہیں اوراق کھلے
عمر بھر کی ہے یہ پوتھی صاحب

پینگ آنگن میں میں یونہی ہلتی رہی
عمر ماں نے مری کاٹی صاحب

ہاتھ آتی تھی سجل کیسے دعا
جبکہ دامن بھی تھا چھلنی صاحب

محمد نوید مرزا

کیا ہوا نقش خیالی آباد
آبسی مجھ میں تو بستی صاحب

.....

پروین سجل کی شاعری میں موضوعات کی فراوانی نظر آتی ہے -ان کی شاعری روایت اور جدت کا حسین امتزاج رکھتی ہے اور ان کا یہ شعری مجموعہ سنجیدہ ادب کے قارئین کے لئے تحفہء خاص ہے-اس حقیقت کی نشاندھی جناب ارشد نعیم نے بھی کی ہے- کتاب کے دیباچے میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں،، پروین سجل کے تجربات ہوں یا روایت کی پابندی میں لکھی گئی شاعری، سب میں ان کو ہم سنجیدہ تخلیق کار کے روپ میں دیکھتے ہیں اور دیانت داری سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک شاعری محض ذات کے اظہار کا وسیلہ نہیں ہے بلکہ ایک فکری اور فلسفیانہ سرگرمی ہے،،
صاحب کی شاعری کی طرح اس کتاب کا انتساب بھی مختلف ہے- آپ بھی پڑھیں،،
انتساب ---- ودیعت کے پہلے لمحے کے نام- جب--- ظہور ہوا---
پروین سجل کی طویل ریاضت اور شعری سفر جاری و ساری ہے اور وہ نت نئے تجربات سے گذر کر اپنی غزل کو نیا شعور عطا کر رہی ہے -بقول نوید صادق،، پروین سجل کے ہاں شدت احساس اور جذبے کی صداقت خوب صورت شعری پیکر تراشتی ہے -ہجر و وصال کے موضوعات کی بات کی جائے تو خود کلامی، غنائیت، رچاؤ، سرشاری، نسائی جذبات کا اظہار اور ان سب کے پہلو بہ پہلو ایک دبی دبی غم انگیزی و غم خیزی اپنا جادو جگاتی نظر آتی ہے،،
آخر میں چند شعر نذر قارئین ہیں----

داستاں جس کو آگے بڑھنا تھا
وہ پڑی تھی نصاب سے باہر

.....

وہ مری جان کو ایسا آیا
مجھ سے میرے ہی معانی پوچھے

.....

اپنی تکمیل کے لئے نفسا
چاک سے کیا ترا جمال اترا

.....

آیئے سرکار جب فرصت ملے تو
منتظر ہر شے ہے گھر کی دست بستہ

.....

روانی دیکھئے اشک رواں کی
کہ بنجر خشک دریا بھر گئی ہے

.....

پاؤں کی سمت جا کے بیٹھ رہیں
احترام اس قدر دیا اس کو

.....

سچ پوچھو تو اپنی طرف سے
یعنی سب ہموار کریں کیا

.....

تیرے آنکھ لگی پانی میں
سیل دریا نہ کنارا چھوڑا

☆☆☆☆☆

کامریڈ شفیق احمد شفیق ..... ایک کمٹڈ محنت کش شاعر

انسان نے جس طرح ترقی کی منازل طے کیں اور تہذیب کے دائرے میں آتا گیا اسی طرح معاشرے تشکیل پانے لگے اور سول سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ انسانی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی مسائل بھی بڑھے امارت اور غربت میں خلیج بڑھتی گئی امیر و مفلس لوگ اور اقوام سامنے آئیں۔ غریب کا استحصال ہونا شروع ہوا۔ غربا اور نادار لوگوں کو آج تک بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکا جاتا رہا ہے۔ غریب کی مشقت امیر کے کام آتی رہی ہے۔ ظلم جبر اور بے انصافی کو روا رکھا جاتا رہا ہے غریب کو زندہ رہنے کے لیے چند لقمے ہی فراہم کیے جاتے رہے یعنی کم آمدنی والے اور مزدور کے جسم سے خون چوسا جاتا رہا۔ ہر دور میں کچھ لوگ اُٹھتے رہے جو اس تفریط کو کم یا ختم کرنے کی کوششوں میں لگے رہے تحریکیں چلیں نظریات وجود میں آئے۔ تمام مذاہب کی بنیادی تعلیم بھی انسان میں برابری کے حقوق دلوانا تھا اور مساوات کا طریقہ رائج کرنا تھا۔ تقریباً دو صدیاں قبل سوشل ازم کا نعرہ بلند ہوا اور کارل مارکس کے نظریات کا بڑی شدت سے پرچار ہوا اور اس کو پوری دنیا کے مزدوروں اور غربا کا مسیحا سمجھا گیا۔ دنیا کے ہر ملک میں اس کے نظریات کے پیروکار اور اس کی باتوں پر لبیک کہنے والے ابھی تک بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ گو کہ سرمایہ دارانہ نظام ہی اپنی پوری شدت اور سفاکی سے پوری دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ ایک دردمند دل رکھنے والا اور ایک حساس دل کا مالک ہی انسانی مساوات کا قائل ہو سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح کامریڈ شفیق احمد شفیق انسانی حقوق کی حفاظت کے لیے ساری زندگی جدوجہد کرتے رہے - تحریر و تقریر دونوں راستوں سے انھوں نے انسانیت کی عظمت کا علم بلند کیے رکھا۔ کامریڈ شفیق احمد شفیق ایک سچا نظریاتی اور جینوئن شاعر تھا، جس نے ہر محفل ہر مجلس اور ہر فورم پر اپنے نصب العین کو کبھی نہیں بھلایا۔ انسانی حقوق کے لیے اور ظلم و جبر سے نجات کے لیے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے آخری دم تک اپنے نظریے کا پرچم سرنگوں نہیں ہونے دیا۔

وہ سرمایہ دارانہ نظام کی فرسودگی اور ناانصافی پر انتہائی نالاں تھے اور پوری زندگی اسی جدوجہد میں گزار دی کہ انسانی مساوات اور حقوق کی جنگ جیت لی جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے ہر سطح پر کام کیا انھوں نے لٹریچر پڑھا اور اس کو تقسیم کیا ہر وقت دوستوں کو قائل کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

فیصل زمان چشتی

آؤ ہم ایسی نئی دنیا کو تخلیق کریں
جس میں انسانی تذلیل و تضحیک نہ ہو
جس میں پوشیدہ اشارات میں تحمیق نہ ہو
آؤ ہم ایسی نئی دنیا کو تخلیق کریں

کوئی حاکم کوئی محکوم نہ پایا جائے
کوئی ظالم کوئی مظلوم نہ پایا جائے
جس میں بد، نیک کا مفہوم نہ پایا جائے
آؤ ہم ایسی نئی دنیا کی تخلیق کریں

جس میں انسان کے جیون میں کوئی کھوٹ نہ ہو
خودکشی سے کوئی انسان کہیں فوت نہ ہو
ہسپتالوں میں دوائی کے بنا موت نہ ہو
آؤ ہم ایسی نئی دنیا کو تخلیق کریں

ان اشعار سے ہمیں اُن کا نظریہ اور انسانیت کی بقا کی خوشبو بڑی اچھی طرح سے محسوس ہوتی ہے اور ہم اپنے پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ایسے لوگ دنیا میں ایک مقصد کے لیے آتے ہیں اور ان لوگوں سے ہزار درجہ بہتر ہوتے ہیں جن کو ہمیشہ اپنے پیٹ کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ کامریڈ شفیق احمد شفیق کا بہت سا وقت پاک ٹی ہاؤس میں گزرتا وہ ترقی پسند مصنفین کے اجلاسوں کے علاوہ حلقہ ارباب ذوق کے اجلاسوں میں بھی باقاعدگی سے شرکت کرتے اور تخلیقات پر اپنے مخصوص انداز میں گفتگو بھی کرتے جس میں ان کا مطمع نظر ہمیشہ انسان دوستی اور اس کی فلاح رہا۔ جب بھی ملتے ان کے ہاتھ کوئی نہ کوئی میگزین یا کتابیں ضرور ہوتی جو دکھاتے اور حسب خواہش عطا بھی کرتے تھے اپنے نام کی طرح انتہائی شفیق اور ملنسار تھے اپنی بات کو کہنے میں بالکل نہیں جھجکتے تھے کوئی بھی سامنے ہو اس سے مرعوب نہیں ہوتے تھے ان کے دل میں یہ عزم اور یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن انقلاب ضرور آئے گا، جس میں مزدور اور کسان کی سُنی جائے گی اور ان کی دادرسی کی جائے گی چاہے وہ ان کے جیتے جی ہو یا ان کے بعد۔ اسی اُمید اور آس پر وہ اس دنیا سے چلے گئے کہ اس دھرتی پر نظام ضرور بدلے گا اور سرخ انقلاب آئے گا۔

بدقسمتی سے عمر کے آخری حصے میں کینسر جیسی موذی مرض میں مبتلا ہوئے اور ملک راہی عدم ہوئے۔ ان کی سوشل میڈیا پر آخری پوسٹ یہ تھی جس میں انھوں نے لکھا کہ:

شاعرو، ادیبو، سیاسی کارکنو، انقلابی ساتھیو!

میں ایک مہلک اور خطرناک بیماری کا شکار ہو چکا ہوں میرا جسم دن بدن سوکھ رہا ہے شاید کچھ عرصہ بعد چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو جاؤں مجھے اپنی جان بچانے کے لیے دس لاکھ کی فوری ضرورت ہے۔ آپ احباب سے جتنا ممکن ہو سکے میرے اکاونٹ میں جمع کرائیں یہ ایک مہنگا علاج ہے آخر میں لکھا انقلابی شاعر کامریڈ شفیق احمد شفیق یہ پوسٹ انھوں نے دو دنوں میں سولہ مرتبہ شیئر کی اس سے لگتا ہے کہ وہ مالی امداد کے شدید منتظر رہے کہ شاید کوئی مداوا ہو جائے اور بچنے کی کوئی امید نکل آئے۔ یہ تو ان کے قریبی رفقا اور عزیز ہی بتا سکتے ہیں کہ کیا بنا یہ تھا وہ سسٹم جس کے خلاف وہ ساری زندگی جدوجہد کرتے رہے کہ عام آدمی کو بھی وہی بنیادی سہولیات میسر ہوں جو امیر آدمی کے تصرف میں ہوتی ہیں۔ اللہ پاک ان کو غریقِ رحمت کرے آمین۔

کامریڈ شفیق احمد شفیق نے ہمیشہ عام آدمی کی بات کی، سسٹم کا رونا رویا جاتا ہے عام آدمی کے حقوق کے حوالے سے پیغام ہوتا ہے۔ معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں بے اعتدالیوں اور ناانصافیوں پر بحث ہوتی ہے۔ غریب اور مزدور پر جبر اور ظلم ان کے خاص موضوعات ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

ابنِ آدم کو غلامی سے چھڑانے کا وہ خواب
ظلم اور جبر کو دنیا سے مٹانے کا وہ خواب
تاج کو نوچنے اور تخت گرانے کا وہ خواب
ساتھیو آؤ کہ اس خواب کی تعبیر کریں

اہل سرمایہ کے پنجوں میں تڑپتی دنیا
ہم نے آزاد کرانے کی قسم کھائی تھی
جو مساوات کی قدروں سے مزین ہوگا
ہم نے اس دور کو لانے کی قسم کھائی تھی
ساتھیو آؤ کہ اس خواب کی تعبیر کریں

اپنا عالم ہے کہ تقسیم ہیں ہم ٹکڑوں میں
ہر کسی ٹکڑے کا لیڈر ہے انا کا مارا
ہر کوئی زعم میں اپنے ہے سٹالن لینن
کوئی ہستی کی نفی کا نہیں کرتا یارا
ساتھیو آؤ کہ اس خواب کی تعبیر کریں

غرضیکہ ان کی شاعری اور شخصیت انسان اور اس کی زندگی سے متعلق مسائل اور تکالیف سے عبارت تھی وہ تمام عمر اپنے طور پر ان کے حل کے لیے کوشاں رہے۔ انھوں نے اپنے حصے کی شمع کو جلائے رکھا اور ہمیں بھی یہ درس دیتے گئے کہ حالات چاہے جو بھی ہوں آپ طاقتور ہوں یا کمزور آپ کی آواز کتنی دور تک جاتی ہے۔ اندھیرے کتنے ہی گہرے کیوں نہ ہوں۔ ظلم کی رات کتنی ہی طویل ہو بادشاہِ وقت کے ظلم و بربریت کے وار کتنے ہی بڑے اور طاقتور ہوں جبر و استبداد کے موسم میں جتنا ہی حبس ہو ظلم کی چکی بھی باریک پیسے، نفرت کی ہوائیں جتنی بھی تند و تیز ہوں۔ آپ نے ہمت و حوصلہ بلند رکھنا ہے اپنے نظریات کی پاسداری کرنی ہے اور اپنے حصے کی محنت ضرور کرنی ہے ظالم حکمراں کے سامنے کلمۂ حق ادا کرنا ہے۔ محبت کے دیپ جلا کے رکھنے ہیں۔ نفرت کی ہواؤں کے بجائے آگ پہ پانی ڈالنا ہے چاہے چند قطرے ہی کیوں نہ ہوں۔ عزم اور ارادے بلند رکھنے ہیں اور نصب العین سے نظر نہیں ہٹنی چاہیے:

آخر میں ان کی نظم سے دو بند دیکھیے:

آؤ ہم ایسی نئی دنیا تخلیق کریں
جس میں انسان نہ انسان کا دشمن ٹھہرے
جس میں فرد نہ کسی دھند کا مسکن ٹھہرے
آؤ ہم ایسی نئی دنیا کو تخلیق کریں

عدل اتنا ہو کوئی اس کا طلبگار نہ ہو
پیار اتنا ہو کوئی اس کا خریدار نہ ہو
حُسن اتنا ہو کہیں حُسن کا بیوپار نہ ہو
آؤ ہم ایسی نئی دنیا تخلیق کریں

چند ہاتھوں میں نہ ہو جس میں بشر کی تقدیر
مختسب جس میں ہو انسان کا اپنا ہی ضمیر
ذہن پہ خوف یا لالچ کی نہ لٹکے شمشیر
آؤ ہم ایسی نئی دنیا کو تخلیق کریں

☆☆☆☆☆

پُھول سوغات کرتے کی دلبری اور نثار ترابی

نام ور شاعر، نثر نگار، محقق اور اُردو ادب کے ہر دل عزیز استاد ڈاکٹر نثار ترابی اپنے زمانۂ طالب علمی سے ہی ادبی افق پر ایک توانا آواز بن کر نمودار ہوئے اور اب چار دہائیوں کے بعد اپنی ہمہ جہت تخلیقی سرفرازیوں کی بدولت وہ علم و ادب کے منظر نامے پر پہلے سے بڑھ کر آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہے ہیں۔ ان کی تخلیقی سفر کی تابناکی اور دل کشی کا ایک زمانہ معترف ہے۔ ڈاکٹر نثار ترابی منڈیر پر رکھا وہ چراغ ہیں جس نے گھر کے در و بام کو بھی روشن رکھا ہے اور گھر سے باہر بھی بہت فیاضی سے علمی و ادبی روشنی تقسیم کی ہے۔

ڈاکٹر نثار ترابی اپنی محنت، خلوص اور لگن سے آگے بڑھتے رہے اور ان پر نئی نئی راہیں کھلتی چلی گئیں۔ انھیں جڑواں شہروں (راولپنڈی، اسلام آباد) کی تقریب میں ایک سینئر شاعر و ادیب کی حیثیت سے اصرار کر کے مدعو کیا جاتا ہے اور ان کی حکمت آموز گفت گو کو محبت اور توجہ سے سنا جاتا ہے۔ اتنی ساری مصروفیات کے باوجود انھوں نے اپنا قلم رواں رکھا ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے گلشنِ خیال میں جدید شعری اظہار کے دل کش پھول اُگانے کے ساتھ ساتھ تنقید اور تحقیق کے شعبوں میں بھی مسلسل اور لائق تحسین کام کیا۔ تحقیق اور تنقید سے ان کی محبت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے مختلف موضوعات پر سیکڑوں مضامین قومی سطح کے معتبر ادبی مجلّات کی زینت بن چکے ہیں۔

فکر و نظر کی سطح پر اپنے مطالعے، مشاہدے اور وجدان کی بدولت قرطاس کی لوح پر حرف رقم کرنے والے ڈاکٹر نثار ترابی کی متعدد تصانیف کے بعد حال ہی میں ملک کے باوقار قومی ادارے نیشنل بک فاؤنڈیشن کے زیر انصرام تنقیدی، تحقیقی اور تجزیاتی موضوع کی

محمد شاہد دھریجہ

حامل ایک اہم کتاب ''تحقیقی و تخلیقی زاویے'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ خوب صورت اور اعلیٰ معیار کی یہ کتاب 230 صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کا ٹائٹل رنگین و دیدہ زیب ہے اس کی پُشت پر ممتاز اور بے بدل دانش ور، عہد ساز تنقید نگار پروفیسر فتح محمد ملک اور ممتاز شاعر و نقاد ڈاکٹر رفیق سندیلوی کی آرا شامل ہیں۔ اسی کی دہائی میں لکھے جانے والے مضامین کے مجموعے اور ادبی فن پاروں پر مشتمل اُن کی اس کتاب کی اشاعت تازہ ہوا کا جھونکا ہے اور فنی سطح پر اُن کی استعمال کردہ علامتوں، استعاروں اور رمزوں کا اپنا ایک لطف اور ذائقہ ہے۔

ادب میں نمایاں مقام حاصل کرنے والے اِس ہمہ جہتی تخلیق کار نے ملک اور بیرون ملک، اپنی ایک الگ شعری شناخت کے ساتھ ساتھ تحقیق و تنقید کے شعبوں میں بھی ناموری حاصل کی ہے۔ ڈاکٹر نثار ترابی کے ہزاروں شاگرد اور مداح ملک اور بیرون ملک مقیم ہیں اور ان کے لیکچرز، خطاب اور ان کی شاعری کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ اس کتاب میں ارشاد شاکر اعوان کے قابلِ تحسین نعتیہ مجموعے پر تحریر سمیت مجید امجد، انتظار حسین، شوکت صدیقی، عبداللہ حسین، احمد ندیم قاسمی، فتح محمد ملک، مظفر علی سید، ڈاکٹر عطش درّانی، جبار مرزا، صفدر وامق، ڈاکٹر منور ہاشمی، حمید قیصر اسد جعفری، اظہر غوری، اختر رضا سلیمی، ڈاکٹر نذر عابد اور کئی معروف اہلِ قلم کی تخلیقات پر اُن کے مضامین شامل ہیں۔ ان نامور مصنفین کے اسمائے گرامی ہی اس کتاب کی اہمیت کا پتہ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر نثار ترابی نے ہر مصنف و شاعر پر اپنی مدلل و متوازن رائے کا کما حقہ اظہار کیا ہے اور اپنے تجزیوں میں انصاف بھی برتا ہے اور لکھنے کا حق بھی ادا کیا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنی گفتگو میں بھی اپنی رائے کا کُھل کر اظہار کرتے ہیں اور کسی فن کار یا اس کے فن پر انتقادی نقطۂ نظر سے بات کرتے ہوئے کبھی بھی اپنے لب و لہجے کو بے توازن اور زبان و اظہار کو غیر شائستہ اسلوب میں پیش نہیں کرتے بل کہ ہمیشہ اعتدال اور میانہ روی سے کام لیتے ہیں۔ اس حوالے سے اُن کا وہ اظہاریہ جو زیرِ نظر کتاب میں شامل ہے، ان کے نظریۂ فن کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''میر انیس کی طرح میری بھی ممکنہ حد تک یہی کوشش رہی ہے کہ ''خیالِ خاطرِ احباب'' کو سدا نظر میں رکھوں۔ میرا ذوقِ نظر، صوفیانہ اندازِ نظر کی پیروی میں آسودگی پاتا ہے، سو میرے نزدیک آبگینوں کو ٹھیس لگانا ادب یا ادیب کا کام ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تو پھول سوغات کرنے کی ادائے دلبری ہے، پتھر مارنے کا عمل ہرگز نہیں ہے۔ یہی میرا

نظریۂ ادب ہے اور اسی کی پاسداری میں مست وابستہ رہنا مجھے ہمیشہ عزیز رہا ہے۔ یاروں کا جو کام ہے وہ یار جانیں۔ میرے تحریر کردہ اظہاریے کے یہ عکس ہائے محبت و عقیدت اگر کسی درجے میں قبولیت کا اعزاز حاصل کر سکیں تو مجھے خوشی ہوگی۔“

اس کتاب کا انتساب ڈاکٹر روبینہ شاہین، ڈاکٹر سلمان علی اور ڈاکٹر نذر عابد کے نام ہے۔

اُن کی یہ تازہ کتاب بے لاگ تبصروں اور ان کے متعدل تجزیوں کی عکس گری کرتی ہے۔ تخلیق کار کی تخلیقات کا مطالعہ قاری کو ایک ایسے جہانِ نو میں پہنچا دیتا ہے' جہاں ہر سو مختلف النوع رنگ بکھرے نظر آتے ہیں۔

علمی و فکری اعتبار سے نہایت پروقار تحریروں پر مشتمل ان 27 مضامین کی تفصیل یوں ہے۔

نعت دریچہ...... ایک تجزیاتی مطالعہ، مجید امجد......ایک مصور، انتظار حسین......ایک علامتی افسانہ نگار، شوکت صدیقی بطور ناول نگار عبداللہ حسین کے نادار لوگ، اداریے کا قاسمی رنگ، خوش آب کی موجیں اور جوہرِ شیریں سخن، منظور جھلا، حیات و فن اور صفدر واثق، فتح محمد ملک......ادب میں فتح مندی کا امتیازی نشان، مظفر علی سید......ایک مطالعہ اور ڈاکٹر روبینہ شاہین، اسد جعفری......ایک ناقابلِ فراموش شاعر، ڈاکٹر عطش دُرّانی......ایک بے بدل محقق، پہل اُس نے کی تھی، تخلیق کی منور راہوں کا راہی، شاداب احسانی......غزل کا ایک منفرد شاعر، ”گ“ سے گڑیا“ ”ج“ سے جاپانی، ”ہوا کا سمندر“ اور تحقیق کا سمندر، اطہر غوری کی غیر مشروط محبت، ”کنارِ خواب“ کا تشنہ مسافر، ”سیڑھیوں والا پُل“ اور حمید قیصر، اُردو مثنوی ”کتاب نامہ“ کا تجزیاتی مطالعہ، ایک سفری یادداشت کی جمال آفرینی، ”اے نشۂ ظہور“......تخلیقی جمال سے مزین ایک مختصر سفر نامہ، جاگے ہیں خواب میں، ”خطوطِ نم“......ایک تجزیاتی تاثر، چینی ادب ”تین سلطنتوں کی داستان“ اور ”فنِ تدوین......مباحث اور مسائل پر اک نظر“ پر شامل ہیں جو معروف و معتبر ادبی جرائد اور قومی اخباروں میں شائع ہوتے رہے ہیں یا انھوں نے کسی قومی یا بین الاقوامی کانفرنس میں پڑھے ہیں۔

تحقیق کے اساتذہ اور طلبہ کے لیے بھی یہ کتاب یکساں رہنمائی کرتی ہے۔ ڈاکٹر نثار ترابی نے ”تحقیق و تخلیقی زاویے“ کے نام سے ایک بہت عمدہ کتاب پیش کی ہے جو انداز کی ندرت اور طرز بیان کی شگفتگی کے باعث معاصر عہد کی یادگار نثری تصانیف میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ توقع ہے کہ ڈاکٹر نثار ترابی کی یہ کتاب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اہلِ تحقیق اور شائقینِ کتب سے بھرپور تحسین حاصل کرے گی اور اپنا مقام بنائے گی۔

☆☆☆☆☆

نوید صادق کی تنقیدِ شعر: ''ارتکاز'' کے حوالے سے

مجھے نوید صادق کی اس کتاب کے مطالعے اور ان کے تنقیدی میلان کا مرکزہ دریافت کرنے کے لیے وہی طریقہ مناسب لگا ہے جو خود انھوں نے حالی پر لکھے گئے اپنے مضمون میں اپنایا ہے۔ انھوں نے حالی کی عشقیہ شاعری پر بات کرنے کے لیے ان کے زمینی عشق کی تفتیش کرنے کے بجائے ان کے کلام میں موجود داخلی شواہد سے اسے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی نہج پر نوید صادق کی اس کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو وہ غزل کے عاشق ٹھہرتے ہیں۔ حالی جو انجمن پنجاب کے نظمیہ مشاعروں کے بنیادگزاروں میں تھے اور نظم کی طرحِ نو ڈالنے والے تھے، جنھوں نے سوانح عمری میں نیا اسلوب متعارف کرایا، جنھوں نے تنقید کی نئی روش کو رواج دیا، ان کے بارے میں نوید کا قلم لکھتا ہے تو توجہ ان کی غزل کی طرف رکھتا ہے۔ انھوں نے زیادہ تر غزل گو شعرا پر لکھا ہے اور ان شعرا پر لکھتے ہوئے بھی، جن کی دیگر ادبی حیثیتیں بھی مسلم ہیں، بیشتر ان کی غزل ہی کو ترجیح دی ہے۔

پہلا امر جو متوجہ کرنے والا ہے اور جو ایک طرح سے جینوئن تنقید نگار کے تنقیدی استحقاق کا پیمانہ یعنی کوالیفائنگ ٹیسٹ بھی ہے کہ انھوں نے کسی بھی شاعر کے جس زاویے پر بات کرنے کا ارادہ کیا ہے، اس سے متعلق بہترین اشعار چن کر الگ کر لیے

عابد سیال

ہیں، اس نفاست اور استیعاب کے ساتھ کہ اس موضوع پر اس شاعر کے ہاں اس سے بہتر شعر منتخب کرنا مشکل تر کر دیا ہے۔ دیکھنے میں یہ بات شاید عام لگے اور یہ سوچا جائے کہ ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ لیکن میں اس لیے اس پر زور دے کر کہہ رہا ہوں کہ فی زمانہ ایسا نہیں ہو رہا۔ تحقیق اور تنقید کے عمل سے پہلے بہت ضروری ہے کہ ادبی مواد، یعنی شاعری یا نثر، ایسا جمع کیا جائے جو معیار اور مقدار کے اعتبار سے اس تنقیدی فریم کا وزن سہار سکے جو تنقید نگار اس مطالعے کے لیے بنائے گا۔ آپ اپنے اردگرد ایسے تنقیدی مضامین دیکھیں گے جن میں بہت بڑے بڑے اور بھاری بھرکم تنقیدی فریم تشکیل دیے جاتے ہیں لیکن بعد ازاں جب ان کا اطلاق شعر پر کیا جاتا ہے تو فریم کے وزن کے نیچے دب کر اشعار کراہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نوید نے جو اشعار منتخب کیے ہیں وہ اس کے بنائے ہوئے فریم کا نہ صرف وزن سہارتے ہیں بلکہ دعوے اور دلیل کا ایسا توازن فراہم کرتے ہیں جس سے لگتا ہے کہ یہ نظریہ انھی اشعار کے لیے وضع ہوا ہے یا یہ اشعار اسی نظریے کے لیے خلق کیے گئے ہیں۔ خواہ حالی کا عشق ہو یا منیر نیازی کی حیرت، خورشید رضوی کا ناسٹلجیا ہو یا توصیف تبسم کی باطنی خواصی، بانی کی پیکر تراشی ہو یا احمد مشتاق کی متحرک تمثال نگاری، خالد احمد کی قصیدہ گوئی کا شکوہ ہو یا صابر ظفر کی نیرنگی، غلام حسین ساجد کی انفراد پسندی ہو یا ممتاز اطہر کی شعلہ بجانی، علیٰ ہذا القیاس، انھوں نے اس تنقیدی کتاب کے توسط سے ہر شاعر کے مجموعے کو جیسے نچوڑ کر ایسے اشعار کا انتخاب پیش کر دیا ہے جو بجائے خود ایک جداگانہ اہمیت کا حامل ہے۔ گوہر نوشاہی صاحب میرے استادوں میں سے تھے، یونیورسٹی میں میں ان کا رفیقِ کار بھی تھا اور ان کے پہلو میں میری نشست تھی۔ روزمرہ گفتگو میں بھی ان کی بعض باتیں ایسی ہوتی تھیں جنھیں میں لکھ لیا کرتا تھا۔ ایک دن مجھے کہنے لگے، یہ بتاؤ اچھے انتخاب کی تعریف کیا ہے؟ میں نے کئی جواب گھڑے: جو اپنے عہد کا نمائندہ ہو؛ جو اس صنفِ ادب کا نمائندہ ہو؛ جس میں کوئی اہم لکھنے والا رہ نہ گیا ہو؛ وغیرہ۔ میری کوششوں پر مسکرائے اور کہا: ایک ہی پیمانہ ہے۔ اچھا انتخاب وہ ہے جس میں کچھ ڈالا تو جا سکے، اس میں سے کچھ نکالا نہ جا سکے۔ نوید صادق کے منتخب کردہ اشعار کو بھی اسی پیمانے پر دیکھیے۔ ان اشعار کو صرف شعری انتخاب سمجھ کر بھی پڑھا جائے تو یہ اپنے خالق شعرا کا اعتبار قائم کرتے ہیں۔ پھولوں کا کاروبار کئی طرح سے کیا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگ گلاب سے ہار اور گجرے بناتے ہیں اور کچھ گل قند۔ اتنا فہم البتہ ہر دو طرح کے کام کرنے والے رکھتے ہیں کہ ہار گوندھنے کے لیے لطافت اور نزاکت والے ہاتھ لگانے

ہیں اور گل قند بنانے کے لیے گلابوں کا کچومر نکالنا ہے۔ میر نے کہا تھا:

گل چیں سمجھ کے چنیو کہ گلشن میں میر کے
لختِ جگر پڑے ہیں نہیں برگ ہائے گل

.....

غزل کے نقاد کو بھی یہ دھیان رکھنا چاہیے کہ کام پھولوں کا ہے اور اس کے کام کا نتیجہ گجرے ہوں گے کہ گل قند۔ نوید صادق نے جس محبت اور لطف کے ساتھ حالی اور اس کے محبوب کے تعلق کے پردے سرکائے ہیں، ان کی تنقید میں بھی غزل کی سی لطافت اور ایمائیت پیدا ہو گئی ہے۔ منیر نیازی پر بات کرتے ہوئے انھوں نے منیر کو دسویں اور بارہویں جماعت کے لیے رائج شعر کی تشریح والے عشقِ حقیقی سے دور رکھ کر جو خدمت سرانجام دی ہے، منیر کے عشاق کو اس پر ان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

تنقیدی کام میں تخلیقی روش کو ساتھ رکھنا تحریر کو بوجھل ہونے سے اور قاری کو متوحش ہونے بچاتا ہے۔ اس روش کے کئی مظاہر نوید صادق کے ہاں ملتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں کے عنوانات میں تازگی کا تاثر ابھارنے کی سعی کرتے ہیں۔ ''شک کا عذاب — منیر نیازی کی غزل''، ''لفظ شیطان، سخن بے ایمان — بانی کی غزل''، ''احمد مشتاق کو سمجھنے کی پہلی کوشش''، ''ممتاز اطہر — عدم تکمیل سے تکمیل تک'' وغیرہ کو اس تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اسی طرح ان کے ہاں ایسے تخلیقی جملے نظر آتے ہیں، شعر کے مصرعوں کی طرح جن پر مکرر کہنے کو جی چاہتا ہے۔ توصیف تبسم کے بارے میں یہ کہنا کہ ''یہ وہ غزل گو ہیں جو راہ چلتوں سے کلام کے عادی نہیں۔'' (ص57)؛ احمد مشتاق کے بارے میں یہ رائے کہ ''احمد مشتاق، کبھی اس سے بات کرنا''، 'کبھی اس سے بات کرنا' جیسے مراحل سے بھی اپنے انداز سے گزرتے ہیں۔'' (ص94) اور خالد احمد کے بارے میں یہ جملہ کہ ''خالد احمد کی شاعری ہی وہ خفیہ راستہ معلوم پڑتی ہے جہاں سے انھیں پکڑا جا سکتا ہے۔'' (ص133)؛ ایسے اظہاریے ہیں جن کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان میں تفہیم کی صفت زیادہ ہے یا حظ بخشی کی۔

غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنایا تھا، نوید صادق نے تنقید میں کہیں کہیں اس اسلوب کی جھلک دکھا کر اپنے ممدوحین اور قارئین سے بے تکلفی کی فضا پیدا کی ہے۔ قاری سے بے تکلفی کی مثال اس جملے میں دیکھیے جو بانی والے مضمون میں شامل ہے۔ کہتے ہیں: ''اب ذرا اس وقت کے منظر نامہ پر غور کیجیے، اتنی بڑی آوازوں کے بیچ — لیکن، ایک منٹ — میں نے تو ان لوگوں کے نام گنوا دیے جو بانی کے ہم عصر ٹھیرتے ہیں —'' (ص71)

ممدوح سے بے تکلفی اور مکالمت کی مثال

کے لیے خالد احمد پر لکھے گئے مضمون کے یہ جملے تحریر کے تاثر کو خوشگوار کرنے اور تخلیق کار اور اس کے ناقد کے درمیان اس تارِ تعلق کی موجودگی کی خبر دیتے ہیں جو محبت کے ریشے سے تیار ہوئی ہے۔ ''خالد صاحب! آپ کو مسئلہ کیا ہے؟ میں خالد احمد شاعر کے ارد گرد گھومتا ہوں اور آپ بحیثیت انسان بار بار سامنے آ کر میرے راستے میں آن کھڑے ہوتے ہیں، آپ ذرا ایک طرف رہیں۔'' (ص 135)

لیجیے۔ اب یہ کاغذ بھی سامنے آ گیا ہے جس پر چار باتیں یاددہانی کے لیے لکھی تھیں کہ تقریب سے واپسی پر نوید صادق سے اکیلے میں کروں گا۔ بے تکلف دوستوں کی محفل ہے اور آپ سب لوگ بھی نوید سے کم و بیش اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی میں کرتا ہوں، تو آپ کے سامنے کہہ دینے میں بھی حرج نہیں۔

پہلی بات — بھائی جان! یہ کتاب کا دیباچہ شاعر علی شاعر سے لکھوانے کی کیا ضرورت تھی؟

دوسری بات — یارِ عزیز! کتاب اور عورت جیسے جیسے موٹی ہوتی جاتی ہے، اس کی محبوبیت اور پذیرائی پانے کی صلاحیت میں کمی کا امکان بڑھتا جاتا ہے، عورتیں اپنی فکر خود کر لیں گی، اپنی کتابوں کو سمارٹ رکھنا آپ کی ذمہ داری ہے۔

تیسری بات — پیارے دوست! جب منیر نیازی والا مضمون زک روبن کے حوالے سے محبت کے تین عناصر کے فریم پر کمال خوبی سے استوار کر لیا تھا، اور آگے چل کر خالد احمد والے مضمون میں محبت کی نظریہ سازی کے لیے لارنس کیسلر تمھاری معاونت کو موجود تھا تو وہاں بھی چند جملے زک روبن والے دوہرانے کی کیا ضرورت تھی جب اس کے فریم کو یہاں استعمال ہی نہیں کرنا تھا۔ پیارے بھائی! بڑے آدمیوں کو بار بار اور بلا ضرورت تکلیف نہیں دیا کرتے۔

چوتھی بات — اے اللہ کے ولی! جب جدید اردو غزل کے نقطۂ آغاز یعنی حالی سے شروع کر کے منیر نیازی، توصیف تبسم، باقی، احمد مشتاق، خورشید رضوی و دیگر اہم شعرا سے ہوتے ہوئے عہدِ حاضر کے اپنے دوست اشرف سلیم تک کی غزل پر نقد سرمایہ فراہم کر دیا تھا جو بہت حد تک منضبط بھی ہے، تو کتاب کا عنوان ''ارتکاز'' رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ لوگ تو پوری کتاب میں ایک مضمون بھی ایسا لکھ لیں جس میں کسی صنف، کسی ادبی دور یا کسی خاص فکری زاویے پر توجہ کی گئی ہو تو پوری کتاب کا عنوان ہی وہی رکھ دیتے ہیں۔ آپ نے ایک صدی کی غزل سے چنیدہ لوگوں پر لکھا ہے تو اس کے عنوان میں اس کی کوئی جھلک ہی دکھا دیتے۔ ایسی بھی کیا حجاب پسندی! اندر باغ کھلایا ہو تو اس کے صدر دروازے پر تختی بھی باغ ہی کی لگاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

اردو شاعری میں سنجیدہ طنز و مزاح کی عمدہ مثال

1958 میں ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب ''اردو اَدب میں طنز و مزاح'' شائع ہوئی۔ اس کے بعد اُردو میں طنز و مزاح کے حوالے سے جو بھی لکھا گیا اُس میں اِس کتاب کا پرتو ضرور نظر آیا۔۔ چار صد سے زائد صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ڈاکٹر وزیر آغا نے 120 سے زیادہ صفحات پر اُردو شاعری میں طنز و مزاح کے حوالے سے بات کی ہے۔ یوں اس حوالہ سے تمام اَدوار اور شعرا کا بھرپور احاطہ کیا گیا ہے۔۔ ان باتوں کو دہرانے کا محل نہیں۔ اس مختصر نشست میں میری کوشش ہوگی کہ میں اردو شاعری میں طنز و مزاح کی روایت اور ڈاکٹر فخر عباس کی شاعری میں اس روایت کی جو continuity نظر آتی ہے اُس کی طرف اشارہ کر سکوں۔

مشہور فلسفی فریڈرک نیٹشے سے کسی نے پوچھا کہ انسان اور حیوان میں کیا فرق ہے تو اس نے کہا: ''تین differences ہیں۔ انسان خود کشی کر سکتا ہے۔ انسان وعدہ کر سکتا ہے اور انسان ہنس سکتا ہے۔''

اسی بات کو آگے بڑھائیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ تخلیق کار ایک عام انسان سیاس طور مختلف ہوتا ہے کہ وہ خود پر بھی مسکرا سکتا ہے بلکہ مسکرائے چلا جاتا ہے۔ کم و بیش تمام ماہرینِ نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ خود پر ہنسنے والے تخلیق کار، جو تلخ ترین حقائق کو لطیف پیرائے میں بیان کر سکیں۔۔ ان کا آئی کیو لیول دوسروں لوگوں سے بہت بلند اور منفرد ہوتا ہے۔ ویسے تو کسی حد تک ہر تخلیق کار ہی witty ہوتا ہے۔ مگر جب قدرت کسی پر مہربان ہو جائے تو بزلہ سنجی گفتگو میں بھی در آتی ہے۔ جب کچھ اور مہربان ہو جائے تو نثر

بشیر احمد حبیب

پاروں میں جھلکتی ہے اور جب یہ حد درجہ مہربان ہو جائے تو شعر کا روپ دھار لیتی ہے۔ فخر عباس وہ خوش قسمت انسان ہیں جن کی witt ان کی باتوں اور ان کی شاعری میں ایسے جگہ بنا لیتی ہے گویا ان کے شعور کا حصہ ہو۔ سیدھی بات تو ہر کوئی کرتا ہے--- لیکن اپنی بات کو مزاح کے دلآویز لباس میں پیش کرنا - - - یا طنز کے رنگ میں communicate کرنا آسان کام نہیں---اور ہر کوئی اس پر دسترس نہیں رکھ سکتا۔ میرے نزدیک یہ بڑے دل گردے کا کام ہے۔ خاص طور پر جب بات مزاح برائے مزاح سے کہیں اُوپر کی ہو--- جب آپ زندگی کی کسی تلخ ترین حقیقت کو طنز و مزاح میں encapsulate کر کے پیش کرتے ہیں تو آپ ایک الگ آسمان چھو لیتے ہیں---- بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں --- مگر وقت کی قدغن نظر میں رکھتے ہوئے میں محض چار بڑے شعرا کی مثالیں پیش کروں گا۔ مگر ان مثالوں سے پہلے میں اس فکری مغالطے کی طرف بھی اشارہ کرنا چاہتا ہوں جہاں عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ شعر یا تو سنجیدہ ہوتا ہے یا پھر شعر میں سنجیدہ بات طنز و مزاح کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہوتی ہے---اور اس کی کوئی تیسری ممکنہ صورت نہیں--- میرے خیال میں شعر کی تیسری صورت وہ ہے جہاں دو مصروں میں دو مختلف دنیائیں آباد ہوتی ہیں۔ یعنی ایک مصرع رات اور دوسرا دن -- ایک مصرع غم و اندوہ سے لبریز اور دوسرا خوشی میں جھومتا گاتا-- ایک مصرع سنجیدہ حقیقتوں سے مزین تو دوسرا خوشی اور حیرانی کی باہم آمیزش کا شہکار--- اور ہر بڑا شاعر ایسی بات کہنے کی قدرت رکھتا ہے--- بات یوں بھی آگے بڑھائی جا سکتی ہے کہ ہر بڑا شعر ایک بیچ کی دو مختلف ڈائمینشنز Dimensions ہم پر وا کر کے بیک وقت ہماری آنکھ میں آنسو اور لب پہ مسکراہٹ لانے کے پوٹینشیل سے معمور ہوتا ہے۔ بقول قابل اجمیری:

ہونٹوں پہ ہنسی، آنکھ میں تاروں کی لڑی ہے
وحشت بڑے دلچسپ دوراہے پہ کھڑی ہے

.....

اور اس کام میں جتنی مہارت ہمیں غالب کے ہاں دکھائی دیتی ہے، اردو شاعری میں کسی اور کے حصے میں نہیں آ پائی--- مگر حفظِ مراتب کو دھیان میں رکھتے ہوئے سب سے پہلے میر تقی میر کے ہاں اس کی مثال دیکھتے ہیں، جس نے اپنی شاعری سے اک جہان کو وقفِ اضطراب کیے رکھا۔ دیکھئے خود پر کیسا لطیف طنز کیا ہے:

ہوگا کسو دیوار کے سائے کے تلے میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

.....

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا--- خطوطِ غالب ہوں کہ دیوانِ غالب - - - مرزا نوشا کی witt کلام میں ایسے عیاں ہے جیسے چمن میں لالہ و گل نمایاں ہوتے ہیں--- شعر دیکھئے اور

دو مصروں میں غالب نے جو دو الگ الگ جہان تخلیق کیے ہیں، اُن کا مزا لیجیے:

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

.....

اُردو زبان کے تیسرے بڑے شاعر اقبال کے ہاں بھی ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ 'بانگِ درا' میں ظریفانہ کلام الگ سے موجود ہے۔۔ مگر بڑے شعر کی وہ تیسری قسم جس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا، 'بالِ جبریل' کے اس شعر میں زیادہ قوت سے نظر آتی ہے۔۔ جہاں کہی ہوئی بات ایک طرف سنجیدگیٔ فکر کی آسودگی کا باعث بنتی ہے تو دوسری طرف ایک بے ارادہ مسکراہٹ کی وجہ بھی بنتی ہے:

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے، اب مرا انتظار کر

.....

اب ہم اگر اپنے عہد کی بات کریں تو اس ضمن میں ہمارا بہترین انتخاب ظفر اقبال ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ زندگی کی عمیق گہرائیوں کو لطیف پیرائے میں بیان کرنے پر ایسی قدرت رکھتے ہیں، جو کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ وہ جس زاویے سے منظر کو دکھاتے ہیں وہ دیکھنے والے کو بیک وقت حیرانی اور خوشی سے مالا مال کر دیتا ہے:

پاؤں پھیلاتا ہوں چادر دیکھ کر میں بھی ظفر
کچھ مجھے اس نے بھی ہے اوقات میں رکھا ہوا

.....

یہیں مجھے انور شعور کا ایک شعر یاد آ گیا:

کھڑے کھڑے مجھے باہر نکال دیتا ہے
وہ اپنے گھر میں تکلف ذرا نہیں کرتا

.....

اس پس منظر میں جب ہم فخر کی شاعری کو پرکھتے ہیں تو وہ ہمیں اردو شاعری کی اس اہم روایت سے جڑے نظر آتے ہیں۔ ہمیں قطعاً یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ ایسا کسی شعوری کوشش سے کرتے ہیں، اگر ایسا ہو بھی تو اپنے قاری کو اس کاوش کی ہوا تک نہیں لگنے دیتے۔ ظفر اقبال کی طرح وہ مزاجاً ہی ایسے ہیں اور یہی مزاج ان کی شاعری میں بھی ریفلیکٹ ہوتا ہے۔ ہم "ملتی رہا کرو" سے ایسی بہت سی مثالیں پیش کر سکتے ہیں:

رک کر اے کاش دیکھتے عمر رواں کی چال
اس ہائی وے پہ کتنے ہی سائن گزر گئے

.....

وہ اس کے کام نہیں ہیں جو اس سے لیتا ہوں
دھڑک رہا ہے اگر دل تو مہربانی ہے

.....

واعظ کے وہ قریب ہوئی اور مجھ سے دور
وہ سخت بے حجاب بھی محجوب ہو گئی

.....

اور اس شعر میں فخر نے شعر کی وہ تیسری سمت دکھائی ہے جو بطورِ خاص میرا موضوع ہے:

کبھی کبھی تو شعر بھی ہونے لگتے ہیں
دل کی چوٹ سے خوش گفتاری ملتی ہے

.....

فخر نے ان دو شعروں میں تخیل کی جس معراج کو چھوا ہے، آپ اس کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے:

اچھا سا اِک منظر ڈھونڈ رہا ہوں میں
دنیا لینز کے اندر ڈھونڈ رہا ہوں میں

.....

میری نظر میں دوستو شدت بلا کی تھی
ٹوٹا پڑا تھا خواب مرے دیکھنے کے بعد

.....

ان کے ہاں روزمرہ کے عام مشاہدوں سے جنم لینے والی خندہ زنی کی یہاں بھی داد بنتی ہے:
بجلی سی اک اور گرا دی ظالم نے
ضبط کی ساری کھیپ جلا دی ظالم نے

.....

ہاتھ پہ رکھے ہاتھ وہ چاہے بیٹھی ہو
گھر میں وہ بے کار بھی اچھی لگتی ہے

.....

جس پر مرے کلام کا دار و مدار ہے
تم ہی تو میری داد ہو، ملتی رہا کرو

.....

ڈاکٹر صاحب چونکہ میڈیکل ڈاکٹر ہیں--- تو یہ پوچھنا بنتا ہے کہ یہاں داد وہ skin disease تو نہیں جو کبھی ٹھیک نہیں ہو پاتی:
باتیں کرنا فون پہ جان اب چھوڑو بھی
خواب میں آؤ، میں بھی سونے والا ہوں

.....

اور یہ شعر بھی کوئی میڈیکل ڈاکٹر ہی کہہ سکتا ہے:
ہم نے کہا کہ چھائیاں پڑنے لگیں جناب
کہنے لگے کہ آپ کی نظروں کے داغ ہیں

.....

ان کے ہاں ندرتِ خیال اور تازگیٔ فکر کے اعلیٰ نمونے کثرت سے ملتے ہیں:
عجب آدمی ہوں خیالوں میں اپنے
پرندوں کی جانب شجر بھیجتا ہوں

.....

ایک ہی کھڑکی بھاتی ہے ہم دونوں کو
ایک گلی کے ہم دونوں خیراتی ہیں

.....

کاٹن کا سوٹ پہن کے ملکہ دکھائی دے
گورے بدن پہ ریشم و اطلس کپاس بھی

.....

ڈاکٹر فخر کو اپنے ڈاکٹر ہونے پر بھی فخر ہے اور وہ قاری کو یہ بات شعروں میں یاد دلاتے رہتے ہیں:
کالج کے کوریڈور پہ آنے لگا تھا پیار
چلتے ہوئے کسی کا جو کاندھا لگا مجھے

کہتا ہے ڈھیر رونے سے زائل ہوا نہ ہو
آنکھوں میں ڈاکٹر کو بھی جالا نہیں ملا

.....

ڈاکٹر فخر کے اس چیلنج کے ساتھ:
تم میں ہمت ہے تو یہ کام دکھاؤ کر کے
ہم تو روتے ہوئے لوگوں کو ہنسا لیتے ہیں

.....

اجازت چاہوں گا--- اِس دعا اور امید کے ساتھ کہ یہ یک وقت نمی اور نمی کے اظہر کی یہ روایت ان کے آئندہ کلام میں مزید مضبوط حوالے کے طور پر سامنے آئے گی!

☆☆☆☆☆

بیسویں صدی کا ایک منفرد جرمن ناول نگار گنٹر گراس اور اس کا ناول ''ٹن ڈرم''

:Abstract

Gunter Grass, Nobel prize winner novelist, poet, artist, sculptor, left - wing political activist, carries within him different and myriad layers of talent. Indeed, to talk about Grass, is, like peeling different layers of an onion, to use one of his titles, out of oeuvre of Grasse's genius. Born in Den zing, now under Polish control, Grass was torn between his German origin and his fascination with Poland given that he was also half - Polish (his mother was Polish Slav). This binary informs his seminal work, Tin Drum where the protagonist Oscar is torn between his possible German or Polish ancestry. Apart from this biographical note, Tin Drum is a mirror in which post war Germans and indeed Europeans could look back at the dark days of life under Nazi Germany. Grass was famous as serving as a sort of conscience of Germany. This work of his brings into sharp relief different dimensions of German dilemma about life under Nazi control and responsibility of ordinary Germans for what happened in Germany and what Germans did to others. In the present article, different and unique perspectives of Gunter Grass the fiction writer have been presented for readers to gauge how great minds think, reflect and enunciate their consciousness.

Keywords:

Masterpiece, social rebel, picaresque novel, ferocious satire, 20th century, tin-drumming.

گنٹر ولہیلم گراس (Gunter Wilhelm Grass) بیسویں صدی کا وہ عظیم جرمن ناول نگار ہے جو سنگین حکایتوں کو شوخ و شنگ انداز میں کمال تخلیقی قرینے اور کئی ایک زاویوں سے اپنے ناول میں پورٹرے کرنے کا ہنر رکھتا ہے۔ اُسے جب 1999 میں ادب کا نوبل انعام دیا گیا تو اس کے کمال فن کا اعتراف بھی کیا گیا، جس کی شوخیوں بھری سنگین حکایتیں تاریخ کے فراموش شدہ چہروں کی پیکر تراشی کرتی ہیں۔ گنٹر گراس کا سال پیدائش 16 اکتوبر 1927 اور سال وفات 13 اپریل 2015 ہے۔ گنٹر گراس کے ناول ''دا ٹن ڈرم'' کا اُردو ترجمہ ممتاز مترجم باقر نقوی نے کیا، جسے کراچی کے پبلشنگ ادارہ اکادمی بازیافت نے 2012 میں شایع کیا۔(۱) گنٹر گراس 16 اکتوبر 1927 کو فری سٹی آف ڈینزنگ (Danzig-Langfuhr) میں پیدا ہونے والا جرمن ناول نگار بیک وقت ایک شاعر، ڈراما نگار، گرافک آرٹسٹ اور مجسمہ ساز تھا لیکن جس فنی ہنرمندی نے اسے نوبل انعام یافتہ تخلیق کاروں کی صف میں شامل کر کے شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا، وہ ناول نگاری کی مغربی صنفِ سخن ہے۔ گنٹر گراس کی مادری زبان جرمن تھی، اُس نے 87 برس عمر پائی۔ اُس کے نمایاں فکشن میں ''دا ٹن ڈرم، کیٹ اینڈ ماؤس، ڈوگ یئرز اور کریب واک شامل ہیں۔

گنٹر گراس جس علاقے میں پیدا ہوا تھا، اب وہ علاقہ پولینڈ کا حصہ ہے۔ اُس نے 1944 تک جرمن فوج میں ملازمت کی اور پھر دوسری عالمی جنگ کے دوران میں امریکہ کی قید میں بھی رہا۔ اس کی رہائی اپریل 1946 میں ہوئی۔ اُس نے اپنے بچپن کے دور کو کثرت کے ساتھ اپنے فکشن میں پورٹرے کیا ہے۔ اُس کی وجہِ شہرت اُس کے پہلے ناول "The Tin Drum" کو قرار دیا جاتا ہے۔ اُس کے پہلے ناول ہی کی توسیع کے طور پر اُس کے مزید دو ناولوں کو قرار دینا غلط نہیں ہوگا۔ اُس کے اگلے دو ناولوں میں "Cat and Mouse" اور "Dog Years" بھی اپنی جگہ کم اہم نہیں ہیں، جنھیں Danzig Trilogy کہا جاتا ہے۔ وہ ڈین زگ کی جانب بار بار مراجعت کرتا ہے۔ اُس کے ناولوں میں سیاسی شعور بھی ملتا ہے اور بائیں بازو کی سیاست کے متعدد پہلو اور ترقی پسندانہ فکر کی بھی کئی ایک جہتوں کا بہت شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے۔ گنٹر گراس جرمنی کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا بھی سرگرم رُکن اور معاون رہا۔ گنٹر گراس نازیوں کے علاقے میں پلا بڑھا، نوجوانی میں جنگ میں بطور 'ٹینک گنر' خدمات انجام دیں، امریکیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور قید بھی

کاٹی اور پھر دوسری عالم گیر جنگ کے اختتام پر رہا بھی ہوا، لیکن گنٹر گراس نے یہ حقائق اور اس جیسے کئی حیران کن انکشافات 2006 میں کیے، جس کے باعث ادبی اور سماجی حلقوں میں اس کی شخصیت اور نظریات کے ساتھ ساتھ اس کے ناول کو بھی متنازع قرار دیا جانے لگا، دوسری جانب ناول پر بنائی جانے والی فلم اور اس کے مرکزی کردار 'آسکر' کے شہوانی اور جنسی جذبات کی عکس بندی بھی کچھ اس انداز سے کی گئی کہ اسے کئی ریاستوں میں ممنوع قرار دے دیا گیا، لہٰذا ادبی اور سیاسی حلقوں میں اس سے نوبل انعام کی واپسی کا تقاضا بھی کیا گیا۔ بہرحال ناقدینِ فن نے گنٹر گراس کے کام کی خوب صورتی میں مخفی اس کی ذہانت سے اس کی غلطی کی تلافی کا اندازہ لگا لیا، انھوں نے گراس اور اس کے فن پارے میں پائی جانے والی اخلاقی کشمکش کو ہی اس کے فن کی قابلِ قدر خوبی قرار دیا۔ اگر وہ اس ناول میں نازی دور کی اُلجھنوں اور کشمکش سے تحریک نہ لیتا تو ایسا شان دار ناول تخلیق نہ کر پاتا۔ دوسری جانب اس کا ہیرو آسکر ماتسیرات انسانی سطح پر اپنی نفسیات، سماجیات اور عصری صورت حال کے عین مطابق تصویر کے متعدد رُخ سامنے لاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مثبت نقطۂ نظر کے حامل ناقدین اور گنٹر گراس کے مزاج اور اس کے فن کو سمجھنے والوں نے واضح کر دیا کہ اُس نے اپنی غلطی کی تلافی اپنے فن اور ذہانت سے ناول میں ہی کر دی تھی۔ ''اِلس ابوٹ جرمن گلٹ'' کے عنوان سے لکھے گئے ایک آرٹیکل کے مطابق:

" When Grass revealed in 2006 that at 17 he had been drafted into the Waffen-SS before the end of the war, it complicated his legacy, leading some to criticize his status as a conscience of the German nation and call on him to hand back the Nobel prize he was awarded in 1999. Yet in Reese's view, the moral conflict Grass and his creation carry inside them is precisely what makes his work endure.

"Grass worked his own enmeshment with the Nazi regime, which he only started talking about much later, into

London-with its unbearable protagonist and tales of Nazi collaboration, it's as controversial as ever. Every audience loves a hero but Oskar Matzerath, one of the most unsettling literary characters of the 20th century, doesn't make it easy for the spectator. (2)

پولینڈ اور جرمنی کی ڈین زِگ میں ہونے والی جنگ میں متوسط طبقے کا رجحان نازیوں کی طرف تھا۔ جنگ کے دہشت ناک دور میں، روسیوں کی آمد اور مغربی جرمنی میں معاشی معجزے کے لیے پوسٹ وار یعنی دوسری عالمی جنگ کے بعد جو فضا قائم کی گئی تھی۔ اس سب نے گنٹر گراس کے حساس اور تخلیقی ذہن سے یکے بعد دیگرے تین ناولوں کی ایک شان دار سیریز تخلیق کرائی۔ جسے ڈین زِگ ٹرائی لوجی کے نام سے شہرت ملی۔ 1959 میں گنٹر گراس کے لیے وجہ شہرت بننے والا ناول ''دا ٹن ڈرم'' منظر عام پر آیا اور یہی ناول 1999 میں اس کے لیے ادب کا نوبل انعام حاصل کرنے کا سبب بنا۔ 1979 میں اس ناول پر فلم بھی

the fabric of this work. That's why this novel is such a work of genius-he answers with a work of art''. (1)

یہ بات صد فی صد درست ہے کہ گنٹر گراس کا آسکر ماتیسرات صرف نظام کو سبوتاژ ہی نہیں کرتا بلکہ وہ اشترا کی بن کر بھی سامنے آتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ پیرس میں نازی فوجی دستوں کے لیے اپنی موسیقی کے فن کا مظاہرہ کرنے پر بھی آخرِ کار رضا مند ہو جاتا ہے، لیکن اس سب کے باوجود متنازع کا لفظ اس کے مذکورہ ناول کے ماتھے کا جھومر بنا رہا ہے۔ گنٹر گراس کے ناول پر 1979 میں پہلی دفعہ ''دا ٹن ڈرم'' کے حقیقی نام کے ساتھ ہی فلم بنائی گئی تھی، جس کے ڈائریکٹر Volker Schlondorff تھے اور اس کے اسکرین پلے رائٹرز دو تھے، جنھوں بہ حیثیت شریک مصنفین کے طور پر کام کیا تھا، جن کے نام بالترتیب Jean-Claude Carriere اور Franz Seitz تھے، اور پھر بعد میں ایک دفعہ پھر 2020 میں لندن میں اس ناول پر فلم بنانے کی تیاری کی گئی تو فلپ آلزمان نے اپنے کالم میں لکھا:

"The stage version of Gunter Grass's 1959 novel is set to open in

بنائی گئی تھی، جسے غیر ملکی زبانوں میں بنائی جانے والی فلموں کا اکادمی ایوارڈ دیا گیا تھا۔ دی ٹن ڈرم بہت مختلف انداز کا حامل ناول ہے جو ابتدا میں قدرے بے رس اور بے لطف سا محسوس ہوتا ہے مگر جیسے جیسے قاری مصنف کے اسلوب سے واقف ہوتا چلا جاتا ہے۔ گنٹر گراس کی ہنرمندی اور اُس کے آرٹ کے جوہر اس کے قاری پر کُھلتے چلے جاتے ہیں۔ 2012 میں گنٹر گراس کے مذکورہ ضخیم ناول کا ترجمہ باقر نقوی نے ''نقارہ'' کے نام سے کیا اور کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک عمدہ ترجمہ ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے ناول کے مکمل متن کا ترجمہ کیا ہے اور ضخامت، طوالت یا پبلشرز کے دباؤ کے خوف سے آزاد ہو کر گنٹر گراس کی منشا سے انصاف کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ ناول کا دیباچہ بھی انھوں نے ''مشک آنست'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے جو بہ ذاتِ خود ایک خاصے کی چیز ہے، جسے لائقِ تحسین مقدمہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ باقر نقوی کی نوبل انعام یافتہ تخلیق کاروں پر بھی گہری نظر ہے اور وہ الفریڈ نوبل پر کتاب لکھنے کے علاوہ 'نوبل ادبیات'، 'نوبل حیاتیات' اور 'نوبل امن کیسو برس' جیسی اہم کتابیں حوالۂ قلم کر چکے ہیں۔ عطا الحق قاسمی نے باقر نقوی کے مترجمہ اور تصنیفی کارناموں کی تحسین کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سچ پوچھیے تو ترجمے کا یہ کام مجھے تو بہت سوں کے طبع زاد کام سے بہت زیادہ قدر و قیمت کا حامل نظر آتا ہے۔ یہ کام ادارے کرتے تو بھی مبارک باد کے مستحق ہوتے، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ باقر نقوی کے انفرادی کارناموں کی بڑھ چڑھ کر پذیرائی ہونی چاہیے۔

جرمن ادب بھی جرمن قوم کی طرح اپنی ایک الگ پہچان اور انفرادیات رکھتا ہے اور ہر دور میں وہاں کی ادبی روایت میں نئے اضافے ہوتے رہے ہیں۔ بیسویں صدی میں ٹومس مان اور ہرمن ہیسے جیسے ناول نگاروں کے بعد اہم نام گنٹر گراس کا ہے، جس نے سماجی حقیقت نگاری، انسانی نفسیات اور مزاحمتی ادب کا ایک نیا زاویہ پیش کیا''۔ (۳)

گنٹر گراس کی ناول نگاری پر ٹومس مان، گوئٹے، فرانز کافکا، ولادی میر نوبوکوف، البیر کامیو، ورجان اروِنگ کے ملے جلے اثرات ملتے ہیں۔ بالخصوص پوسٹ وار (دوسری عالمی جنگ کے بعد)، کے ادیبوں میں گنٹر گراس کی تخلیقات کا انداز منفرد ہے۔ ''دا ٹن ڈرم'' کے علاوہ اُن کی تخلیقات میں ''کیٹ اینڈ دی ماؤس1961، ڈوگ ائیرز 1963، فلاؤنڈر1977، دی ریٹ 1986، مائی سینچری1999، کریب واک2002اور یادداشتوں پر مشتمل کتاب ''پیلنگ دی

اونیان" 2002 شامل ہے جو 2006 میں منظر عام پر آئی تھی مگر جو شہرت "دا ٹن ڈرم" کو ملی، وہ کسی اور تخلیق کو کم ہی نصیب ہوئی۔ سات سو آٹھ ہتر صفحات اور 144 ابواب پر مشتمل اس ضخیم ناول میں کرداروں کی طومار اور واقعات کا تسلسل پہلے پہل تو قاری کا الجھا کر رکھ دیتا ہے مگر جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ قاری، گنٹر گراس کے اسلوب بیان کا شناسا سا ہوتا جاتا ہے۔ کہانی کا راوی آسکر ماتسیرات ہے جو پہلے خود کو آسکر برالسکی مانتا تھا، لیکن اب وہ ذہنی مریضوں کے ہسپتال میں بستر پر پڑا ایک لاچار شخص ہے اور وہ اپنی کہانی لکھتے ہوئے بیک وقت خود کو دو مختلف لوگوں کی مانند گردانتا ہے، وہ آسکر کو مخاطب بھی کرتا ہے اور اس کی سوچوں کا ترجمان بھی بنتا ہے۔ آسکر اور اس کے نقارے کے معجزات بھی دکھاتا ہے اور اس کی بدقسمتی بھی، اس طرح قاری، گنٹر گراس کی طلسماتی حقیقت نگاری سے مسحور ہوتا چلا جاتا ہے۔ 500 صفحات کے بعد کہانی کا کچھ حصہ "برونو" بیان کرتا ہے جو آسکر کا میل نرس اور نگہبان ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ "نقارہ" ایک نوجوان کا 'پری وار' اور 'پوسٹ وار' یعنی جنگ سے پہلے اور دوسری عالم گیر جنگ کے بعد پولینڈ اور جرمنی کے ماحول میں اصل حالات و واقعات، جگہوں اور لوگوں کو ناول کی کہانی میں پیش کرنے کا انوکھا انداز ہے، جسے بیسویں صدی کا ایک کئی ایک حوالوں سماجی پس منظر و پیش منظر کہا جا سکتا ہے۔ اس صدی کی شان موڈز، فضا، تاریخ اور ترقی کی رفتار اس ناول میں یوں سما گئی ہے کہ ناول کو بیسویں صدی کا نہیں بلکہ بذات خود مغرب کی سماجی زندگی کی بیسویں صدی کہنا زیادہ مناسب ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں ایک مثال ملاحظہ کی جا سکتی ہے:-

"صدیاں شروع ہوتی ہیں، ختم ہوتی ہیں، ایک کے بعد دوسری، جیسے وہ کبھی تھیں ہی نہیں، مگر پل باکس تو باقی رہنے کے لیے اہرام مصر کی طرح رہنے والے ہیں---
اس کام میں کوئی نہایت ذہین، شاید بیسویں صدی کے گویا گنٹر گروس نے آسکر کی زبانی بیسویں صدی کا تاریخی، ثقافتی، ادبی، سماجی تعارف بھی کروایا ہے اور اس کے ہاتھ میں تھمائے موقلم (پینٹ برش) سے وہ تمام شیڈز بھی گہرے کر دیے ہیں، جن سے اس صدی کے خدوخال ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ آسکر کے تینوں عنوان 'ظالمانہ'، 'عارفانہ' اور 'پیزار' گویا ہمارے صد سالہ عہد کے دریا کو کوزے میں بند کر دیتے ہیں اور ماسٹر پیرا کے منہ سے یہ الفاظ کہلوا کر گنٹر گراس مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے کہ تم نے ہماری صدی کو اس کا نام دے دیا۔" (۵)

ان تین ناموں میں سو سالہ واقعات کی تاریخ اور روح سمائی ہوئی ہے، جس کے

اثرات بیان کرنے کے لیے تین ہزار سال بھی کم ہوتے ہیں۔
وباؤں، جنگوں، سیاسی اور معاشی اتھل پتھل کے واقعات اور سانحات سے بھر پور یہ صدی ''نقارہ'' جیسے ادب پاروں کی وجہ سے لازوال تاریخ بن کر محفوظ ہوگئی ہے، جس دور کا قاری اسے پڑھے گا اور سمجھے گا، وہ نہ صرف بیسویں صدی کا منظرنامہ اپنی آنکھوں کے سامنے پائے گا بلکہ اس کے پس منظر و پیش منظر سے بھی آگاہ اور واقف ہوجائے گا۔ ناقد-سنِ فن اور قارئین کا ردعمل اپنی جگہ مگر گنتر گراس کے تخلیقی ہنر اور ادبی مذاق اور مزاج نے 'نقارہ' جیسے کثیر الجہتی موضوع کے حامل ناول کو اپنے شعور و ادراک کی کٹھالی میں پگھلا کر کندن کر دیا ہے۔ اس کندن کی آب و تاب میں ایک خاص دور کی تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی چمک بھی شامل ہے اور ہر دور کے سماج کے افراد کی متنوع نفسیات کی آفاقی جھلک بھی اس ناول میں دیکھنے کو ملتی ہے اور سرخ اور سفید رنگ کے حامل متنوع کردار مذکورہ ناول 'دا ٹن ڈرم' یعنی (نقارہ) میں اپنے عصری ماحول کے ہر رنگ اور ہر آواز کی عکس گری کرتے ہوئے اپنے تمام تر تحرک کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ وہ بیک وقت جبر، جنگ، قہر اور ظلم کے خلاف اعلان جنگ بھی ہے اور مظلوم و مجبور کی صدائے احتجاج بھی ہے۔
''واحد ذہن انسان نے اپنا واضح، محکم انداز میں، اور ہمیشہ رہنے والا اظہار کیا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں، ہمارا ماہر آثاریات کہے گا، میں سوچ رہا ہوں اس کا نام بھی، کیکہ نہیں؟ کوئی دستخط یہ بتانے کے لیے کہ ماسٹر کون تھا؟ --- بہت اچھا جناب، یہاں لکھا ہوا ہے:
ہربرٹ لانگیز، سن انیس سو چوالیس اور عنوان ہے: ظالمانہ، عارفانہ، بیزار۔
ہبرا: تم نے ہماری صدی کو اس کا نام دے دیا ہے۔'' (۶)
''نقارہ'' دراصل آسکر نامی بچے کا کھلونا ہے جو اس کی تیسری سالگرہ پر ملتا ہے اور تین سال کی عمر میں وہ اپنی ایک خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ میں ہمیشہ بچہ ہی رہوں اور اپنا نقارہ بجاتا رہوں۔ وہ کبھی اپنے نقارے کو خود سے الگ نہیں کرتا اور بالغ ہونے کے باجود بچہ ہی بنا رہتا ہے۔ اگر کوئی اس کا نقارہ چھیننے کی کوشش کرتا ہے۔ تو آسکر ایسی زوردار چیخ مارتا ہے جو اس کی سکول ٹیچر کی عینک سے لے کر بڑے بڑے شاپنگ مال کی کھڑکیوں تک ہر شیشے کو چکنا چور کر دیتی ہے۔ وہ اکثر اپنا نقارہ بجا بجا کر توڑ ڈالتا ہے اور پھر بالکل ویسا ہی سرخ اور سفید رنگ کا گلے میں لٹکانے والا نقارہ مانگتا ہے۔ پہلا نقارہ ٹوٹنے پر جب اسے نیا نقارہ ملتا ہے، تو وہ خود سے سوال کرتا ہے کہ کیا لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ میں راویت سے اس لیے چمٹا ہوا ہوں کہ مجھ پر اُصولوں کا باریابوجھ ہے؟

یہ بات نقارے کی علامتی اہمیت اور حیثیت کو واضح کرتی ہے۔ نقارہ نوازی ضروری ہے، خواہ نقارہ ہر بار نیا ہی کیوں نہ لینا پڑے! یعنی روایت اگر جدت کی متقاضی ہو تو اصولوں سے انحراف کیا جا سکتا ہے۔:

برائی کو ایک شخص واحد یا واحد قوم کا وصف نہیں کہا جا سکتا، عوام یا معمولی لوگ بھی خاص لمحے پر اچھائی یا برائی ظاہر کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اس مرکزی خیال کو گنٹر گراس نے 'ٹینلجی' کے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کے خیال میں ایک نقارہ کیا کیا کر سکتا ہے، اس کی ایک خوب صورت مثال ملاحظہ کی جا سکتی ہے:

''آج آسکر سادہ لفظوں میں بس اتنا کہنا چاہ رہا ہے کہ وہ پتنگا بھی ایک اعلان کر رہا تھا۔ میں نے خرگوش، لومڑیوں اور چوہوں کو بھی اعلان کرتے سنا ہے۔ مینڈک اپنی مسلسل اور قایم مزاج کوششوں سے نقارے کے ذریعے کسی طوفان کو بیدار کر سکتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہدہد کیڑوں کو اپنی پناہ گاہوں سے نقارے کے ذریعے ہی باہر نکال سکتے ہیں۔ آدمی ٹین کے تسلوں، پیتل سے بنے برتنوں، کیتلیوں کو نقارے کی طرح بجا سکتے ہیں۔ حملے کے لیے آگے بڑھتی ہوئی فوجیں نقاروں کے ذریعے توپوں کی گولہ باری کا اعلان کرتی ہیں۔ ہم نقارے کے ذریعے نئے کام کا اعلان کرتے ہیں، لوگوں کیڑوں، مکوڑوں اور جانوروں کو باہر نکالتے ہیں، مسلسل نقارے بجا بجا کر کچھ یاد دلاتے ہیں۔ نقارے بجانے والوں میں سپاہی بھی ہوتے ہیں اور افسر بھی۔ موسیقار بھی ہوتے ہیں جو ساز کے تاروں اور مضراب کے لیے ساز ینے ترتیب دیتے ہیں۔ میں نقارے پر خود آسکر کی کوششوں کو بیان کر سکتا ہوں'' (۷)

'ٹن ڈرمنگ' ایک محاورہ بھی ہے جو توجہ کے حصول کے لیے پریشانی پیدا کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ آسکر اور اس کے خاندان کے مابین ذہنی تفاوت، اس دور کے مڈل کلاس لوگوں کی ذہنیت اور سماج کے مجموعی طرز فکر کی علامت کے طور پر سامنے آنے والا نقارہ دراصل گنٹر گراس کے دل کی آواز ہے۔ تاہم اسے محض من کی آواز سمجھ لینا ہی کافی نہیں ہے۔ نقارہ اپنے عصری مسائل سے لے کر دور حاضر کے مسائل تک کا راگ الاپتا ہے۔ یہاں تک کہ آسکر کی نقارہ نوازی اسے ناقابل برداشت فرد بنا دیتی ہے۔ وہ اپنی نقارہ نوازی سے نیشنل سوشلسٹوں کا نظم و نسق اور جنگی حکمت عملی برباد کرتا ہوا نظر آتا ہے، یہاں تک کہ ایک بار نازیوں کی ریلی کے مارچ کو اپنے نقارے کی تال پر ہونے والے رقص میں بدل دیتا ہے۔ اگر اس نے ذاتی تجربات کو مبالغے کی حد تک تصور کر کے پیش کیا ہے، جس سے ایک طرف میجک ریلزم یعنی طلسماتی حقیقت نگاری کی رومانوی فضا

جنم لیتی ہے تو دوسری طرف سفاک سماجی حقیقت نگاری عصری ماحول کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ اس عصری ماحول میں جو اخلاقی زوال اور انسانیت کی تباہی کا دور تھا، آسکر کی نقارہ نوازی گویا رسوائیوں، فحاشیوں اور اخلاقی برائیوں کی آواز کو اپنے شور میں گم کر لینے والی آواز ہے۔ گنٹر گراس کے مطابق:

''میز کے نیچے آسکر اپنے تباہ شدہ نقارے کے ساتھ بیٹھا ہوا موسیقی کے آخری قطرے نچوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری کم زور مگر باقاعدہ تھاپ وجد میں کھوئے افراد کی پسند رہی ہوگی، جو کمرے میں بیٹھے یا لیٹے ہوئے تھے۔ اس لیے کہ میری نقارہ نوازی، چومنے اور چوسنے کی مسلسل آوازوں پر وارنش کی طرح چھائی ہوئی تھی۔''(۸)

آسکر کا تعارف اور کردار کی مزید وضاحت کچھ اس انداز سے کی جاسکتی ہے:

ننھے کوب زدہ آسکر کے علاوہ گنٹر گراس نے اس ناول میں بے شمار کردار تخلیق کیے ہیں جو آسکر کی پیدائش سے پہلے اس کہانی کی شروعات کرتے ہیں اور پھر کہانی کے ہر مختلف موڑ پر باری باری سامنے آتے رہتے ہیں۔ نسوانی کرداروں میں آسکر کی نانی (اپنے چار لہنگوں کے ہمراہ)، اس کی ماں، ''ایگنس''، ''اس کی استانی''، ''مس اسپولین''، ''ماریا''، ''لینا گریف''، ''روزودا''، اور سسٹر ڈوروتھا کے علاوہ بھی کئی کردار پیش منظر پر جلوہ افروز ہوتے ہیں، جب کہ مرد کرداروں میں آسکر کے دونوں باپ (اصلی اور قیاسی ''جان برانسکی'' اور ''ماتسیرات'' کے علاوہ مسٹر برونو، کلیپ، 'ڈاکٹر ہولائز'، 'اسٹیفن'، 'ماسٹر بیرا، گریگر کوواچی، 'فلپ'، 'وٹلز' اور ونسٹنٹ برانسکی وغیرہ جیسے کئی اور کرداروں کی بھی طومار ہے۔ تاہم ایک بڑے کینوس پر پھیلے اس ناول کے ہر موڑ اور واقعات کی بنت میں کوئی کردار بھی غیر ضروری معلوم نہیں ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ گنٹر گراس کے قلم نے ان کرداروں کے خوب صورت پیکر تراش کر گویا ناول میں جا بجا نگینے جڑ دیے ہیں اور ایک اچھے ناول کی ایک پہچان یہ بھی قرار دی جاسکتی ہے کہ اس کے کردار ایک دوسرے میں پیوست اور آپس میں مضبوط انسلاک کے حامل ہوں۔ ''نقارہ'' کے کردار ہمیں جرمنی کی سرزمین اور وہاں کی ثقافت، تہذیب و تمدن، تاریخ، جغرافیہ، جنگ، امن، سیاست، مذہب، صنعت، سماجی زندگی اور فنون لطیفہ کی صورت میں عصری اور آفاقی رنگ دکھاتے چلے جاتے ہیں۔ قاری آسکر کی معیت میں اور اس کے خیالات کے ذریعے تہ خانوں اور کمروں کی تزئین سے لے کر آرٹ گیلریوں تک اور پہاڑی علاقوں سے لے کر سمندری

ساحلوں تک سفر کرتا چلا جاتا ہے۔ گنٹر گراس کا کمال یہ ہے کہ وہ تاریخ کا چہرہ اس طرح دکھاتا ہے کہ مذہب، جغرافیہ اور تہذیب وتمدن خود بخود واضح ہوتے چلے جاتے ہیں اور انداز بھی واضح اور سادہ رہتا ہے پوسٹ وار یعنی دوسری عالمی جنگ کے بعد کے حالات وواقعات کو کچھ اس انداز سے ناول کا سرنامہ بنایا گیا ہے:

''جنگ ختم ہو چکی تھی۔ ایسے امن کے معاہدے جو مزید جنگ کا باعث ہو سکتے تھے، دوبارہ لکھے جا رہے تھے۔ وستولا دریا کے دہانے کے اطراف کے علاقے کی ایک خط کے ذریعے نئے سرے سے حد بندی کی جا رہی تھی۔ یہ خط۔ ووگل سانگ۔ سے ہوتا ہوا امپیر تک، نوگاٹ سے ٹیپکل اور وستولا سے۔ تسایکاو۔ اور وہاں سے زاویہ قائمہ کی صورت۔ شون فلیس۔ تک جاتا تھا۔ وہاں سے ۔ ساسکوشین۔ کے جنگل، اولومین اور لیسٹرن، رامکاو اور میری نانی کے گاوں بساو کو ایک طرف چھوڑتا ہوا بحر بالٹک کے علاقے کلائن کائیز جاتا تھا جس لیگ آف نیشنز کی زیر نگرانی آزاد ریاست بنا دیا گیا تھا۔ پولینڈ کو بھی۔ ویسٹر پلاٹے۔ نام کی ایک آزاد بندرگاہ دے دی گئی تھی جس میں گولہ بارود رکھنے کے گودام تھے اور ریلوے کی ایک انتظامیہ تھی اور ہو ییلیس پلاٹز پر اسکا اپنا ایک ڈاک خانہ بھی تھا۔''(۹)

اس سب کے ساتھ ساتھ گنٹر گراس نے ''نقارہ'' میں انسانی جذبات اور نفسیات کے آفاقی رنگ بھی دکھائے ہیں۔ مرکزی کردار اور مرکزی قصے سے منسلک ذیلی کہانیاں ہمیں ایک مخصوص یورپی سماج اور انسانی زندگی کے ہر پہلو کی نقاب کشائی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ایک کوہانی کمر والا تین فٹ قد کا بچہ اپنے ذہنی سفر اور ذہنی عمر کے اعتبار سے ہر کردار پر بھاری پڑتا دکھائی دیتا ہے، لیکن اس کی ابنارملٹی یا اس کا بگڑا ہوا ذہنی توازن اس کے ذہنی اور جنسی رویوں پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ وہ بچپن ہی سے اپنی ماں کو دو مردوں میں سینڈوچ ہوتے دیکھ رہا تھا اور اپنے باپ کے متعلق بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ جان برانسکی اس کا اصل باپ تھا یا قیاسی ایسے گھریلو ماحول میں 'آسکر' کی شخصیت تضادات اور تناقضات کا ملغوبہ بن کر سامنے آتی ہے، وہ اپنی ذہنی اور جنسی ضروریات کا بندوبست اپنے انداز میں کرتا ہے اور ماریا سے جسمانی تعلقات قائم کر کے اپنے ہی جیسے ایک اکھڑ مزاج لڑکے (کرٹ) کا باپ بن جاتا ہے، جس کا قیاسی باپ بھی 'ماتسیرات' ہی ہوتا ہے۔ جرمن سماج کے یہ جنسی گورکھ دھندے 'آسکر'، 'ماریا'، 'ماتسیرات'، 'جان' اور 'ایگنس' کے معاشقے، 'آسکر' کے جنسی اور ذہنی بلوغت کے بیانیے اور اس دور کے مرد وزن کے

شہوانی اور جنسی معاملات اور تعلقات اور رجحانات کے کھلے ڈلے اظہار نے اس تخلیق کو متنازع اور فحش بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے ماضی کے متعلق راز، دیر سے ظاہر کرنے اور جنگ اور مذہب سے متعلق دوغلا رویہ اپنانے کے الزامات لگا کر اس کو نوبل انعام کا حق دار نہ ہونے کا اس ناول کو طعنہ بھی دیا گیا۔ باقر نقوی ناول کے "دیباچہ" میں اس امر پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

"کسی حد تک متنازع ہونے کے باوجود اگر اس کے اس ناول کو بیسویں صدی کے جرمن زبان کے دس بہترین ناولوں میں شمار کیا گیا ہے۔ اس ایک بات سے بھی اس ناول کی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے میرے خیال میں کسی کتاب کا متنازع ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ لکھنے والے نے اپنے موضوع کو نئے انداز میں دیکھنے اور نئے طور سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ یقینی طور پر اپنے موضوع کے کچھ ایسے پہلو نمایاں کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ جو عمومی مزاج کے خلاف ہیں اور اسے بدلنے کی قوت رکھتے ہیں"(10)

درحقیقت گنتر گراس ایک بالکل انوکھے کردار کے ذریعے یہ سوال قائم کرتا ہے کہ کیا اب جرمن قوم کو بالغ ہو جانا چاہیے؟ یا آسکر جیسے بونے کی طرح بھیانک نقارہ نوازی جاری رکھنی چاہیے؟ آسکر اس ناول میں پولش قوم کا استعارہ بن کر سامنے آتا ہے۔ اس کے مسلسل احتجاج، انتشار اور انارکی سے بھرپور آواز نے پوری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا وہ بورژوا کلاس اور نازیوں کی بربریت کی بیک وقت مذمت کرتا نظر آتا ہے۔ سالپے قبرستان، پولش ڈاک خانہ اور اس کا ہسپتال ایسے دل خراش مناظر سامنے لاتے ہیں کہ اپنی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود آسکر سے ہمدردی ہونے لگتی ہے اور جنگ کی ہولناکیوں پر دل کڑھنے لگتا ہے۔ انسان کے جنگی جنون، مادی وسائل پر قبضے کے حصول، اقتدار اور طاقت کی ہوس کی اس سے زیادہ کھلی اور واضح مثالیں اتنی بڑی تعداد میں کسی اور ناول میں کم ہی دستیاب ہوں گی اور اس پر گنتر گراس کا لگایا گیا فلسفے اور جذبات کا تڑکہ انسانی نفسیات کے کئی ایک مخفی پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نقارہ ایک جھنجھوڑ دینے والا اور دل دہلا دینے والا ناول ہے، جس کا کینوس بیک وقت سماجی حقیقت نگاری اور طلسماتی حقیقت نگاری کے رنگوں سے سجا ہوا ہے اور گنتر گراس کے اس ناول کا تنقیدی جائزہ لینا دریا کو کوزے میں بند کرنے جیسا مشکل کام ہے۔ اس کے ہر ہر باب سے ایک منفرد مہک اور ہر ہر کردار کے مطالعہ سے ایک مختلف رنگ خود بہ خود مترشح ہوتا چلا جاتا ہے۔ جسے چند صفحات میں سمیٹنا ممکن نہیں باقر نقوی کا کہنا

بڑی حد تک درست ہے:

''مشک آنست کہ خود ببوید، نہ کہ عطار بگوید''

(۱۱)

گنٹر گراس کے مذکورہ ناول کے عمیق مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ایک سنگین بُرائی کو کسی ایک شخص یا فردِ واحد کے ساتھ منسوب نہیں کیا جا سکتا اور عمومی صلاحیتوں اور کردار کے حامل افراد کسی مخصوص اچھائی یا بُرائی کے بھی حامل ہو سکتے ہیں۔ اس مرکزی تصور کو تھیمیٹکی کئی ایک طریقوں سے ناول کا موضوع بنایا جا سکتا ہے، جیسا کہ گنٹر گراس نے بھی اپنی 'ٹرائی لوجی' میں اس موضوع کو کئی ایک پہلوؤں کی تہ داری کے سیاق میں پیش کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ گنٹر گراس نے اپنے اس ناول ''دا ٹن ڈرم'' میں بھی اسی تصور کو کئی ایک زاویوں سے پیش کرنے کی کام یاب اور بھرپور سعی کی ہے۔ گنٹر گراس کا یہ ناول اپنی علامات کی تہ داری کی وجہ سے بھی انفرادیت کا آئینہ دار و غماز ہے اور پھر ان علامات کی ترتیب و تنظیم بہت زیادہ اہمیت کی حامل کہی جا سکتی ہے اور جس طریقے سے انسانی تاریخ تغیرات سے دوچار ہوتی رہتی ہے، اس ناول کا یہ حوالہ بھی اہمیت سے خالی نہیں ہے۔ ایک جوان جو ''دا ٹن ڈرم'' کا پروٹیگنسٹ قرار دیا جا سکتا ہے، جس کی افزائش کا عمل تین سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد رُک جاتا ہے اور وہ جنسی اور جذباتی حوالے سے پوری طرح شعور کی حدوں کو چھو چکا ہے۔ کئی ایک زاویوں سے ڈرم کو ایک نہایت اہم آلۂ موسیقی قرار دیا جا سکتا ہے جو کثیر الجہتی علامات کا علم بردار ہے اور جس کی متعدد تعبیرات و تصریحات کی جا سکتی ہیں۔ یہ فقط اُمید و بیم کے حامل درخشاں مستقبل اور جیتی جاگتی زندگی ہی کی علامت نہیں ہے بلکہ یہ ایک واحد اور مؤثر طریقہ ہے، جس کے وسیلے سے آسکر پوری دُنیا کے ساتھ اپنے مافی الضمیر کا کھل کر اظہار و ابلاغ کر سکتا ہے۔ گنٹر گراس کے ناول ''دا ٹن ڈرم'' کو کئی ایک حوالوں سے بیسویں صدی کا ایک بڑا جرمن ناول قرار دیا جا سکتا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ گنٹر گراس، نقارہ مترجم باقر نقوی (کراچی: اکادمی بازیافت 2012)، ص ۴۔

2- "It's about German guilt: why the tin drum is still .....at the cornet, London ,24- 29 February.

3-Philp Oltermann in Berlin, Tuesday 20 February, 2020 GMT (tweet@philpoltermann)

۴۔ گنٹر گراس، نقارہ مترجم باقر نقوی، تقدیم عطا الحق قاسمی مشمولہ 'نقارہ' (کراچی: اکادمی بازیافت، 2012)، ص 977-

۵۔ گنٹر گراس، نقارہ مترجم باقر نقوی (کراچی:

اکادمی بازیافت، 2012)، ص- 448
۶- گنتر گراس، نقارہ مترجم باقر نقوی (کراچی:
اکادمی بازیافت، 2012)، ص -60
۷- ایضاً، ص- 296
۸- ایضاً، ص -87
۹- ایضاً، ص ص 351-350
۱۰- گنتر گراس، نقارہ مترجم باقر نقوی (کراچی:
اکادمی بازیافت، 2012)، ص -21
۱۱- گنتر گراس، نقارہ مترجم باقر نقوی، دیباچہ،
مشت آنست (کراچی: اکادمی بازیافت
2012)، ص-12

نوٹ:

اگر- ڈاڈا اِزم اور 'نازی ازم' کی مزید تصریح و تشریح کرنا مقصود ہو تو ڈاکٹر سہیل احمد خان کے تنقیدی مقالات کا مجموعہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے-

''گنتر گراس کے ناول ''نقارہ'' میں جس قدر نازی ازم کے اثرات ہیں اسے 'ڈاڈاازم' کی تحریک کے رجحان کا خصوصی ناول قرار دیا جا سکتا ہے لفظ 'ڈاڈا' جرمن زبان سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی جرمن لفظ سے تحریک پکڑتا ہے، یہ دراصل ایک خاص ذہنی کیفیت ہے جو جنگوں کے بعد والی 'ادبی نسل' کو متاثر کرتی ہے- ڈاکٹر سہیل احمد خان اِسے ذہن کے غیر مربوط اور غیر منطقی پہلوؤں کے حوالے سے اہم تنقید سمجھتے ہیں اور مروّجہ سماجی رویوں اور اِسے فرسودہ نظام و نظریات کے خلاف ردِعمل کے طور پر لیتے ہیں- ایسے ردعمل کو احتجاج، اعلان کے طور پر لینا اور اس کی حاکمیت کا اعلان کرنا --- ادبی تنقید میں اسے 'ڈاڈاازم' کا نام بھی دیا گیا ہے- بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو آسکر ماتیسرات کا کردار اور اس کی ٹن ڈرمنگ اس نظریے کا منہ بولتا ثبوت ہے- اپنی تیس سالہ زندگی میں مسلسل نقارہ نوازی کر کے وہ اشتراکیت کے گیت بھی گاتا ہے اور احتجاج کی صدا بھی بلند کرتا ہے- ('ڈاڈا اِزم کی مزید وضاحت کے لیے مجموعہ ڈاکٹر سہیل احمد خان ملاحظہ کیا جا سکتا ہے-)

ڈاکٹر سہیل احمد خان، مجموعہ سہیل احمد خان (لاہور:
سنگِ میل پبلی کیشنز، 2009)، ص-381

☆☆☆☆☆

نبیل احمد نبیل

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورنٹل کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

کوئی سرخ فیتہ نہ تھا، ہتھیلی میں کھجلی نہ ہوتی تھی۔ مٹھی گرم کرنے کا رواج ہی نہیں تھا۔ ون ونڈو آپریشن ہر کوئی مددگار تھا یہی وجہ تھی کہ بے روزگاری نہ ہونے کے برابر تھی، تعلیم سو فیصد صرف قدرتی وسائل سے مالا مال ہونا کافی نہیں ہوتا، اُن کا صحیح استعمال بھی ضروری ہے۔ اگر دریا ہوں لیکن ڈیم نہ بنا پائیں تو وہ پانی بے کار معدنیات ہوں مگر انہیں دھرتی کے سینے سے باہر نہ نکالا جا سکے تو وہ دولت کس کام کی؟ مین پاور ہو لیکن نوکریاں نہ ہوں تو مسلسل عذاب! ہم کافی دیر تک ووکیشنل انسٹی ٹیوٹ دیکھتے رہے۔ وہ ایک قسم کی فیڈرز بھی ہیں۔ جب بھی کسی

کارخانے کو مخصوص کاریگر کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان سے رابطہ کرتا ہے۔ ان کے پاس ہر ٹریڈ کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ یہ مہیا کر دیتی ہیں یا پھر اس کے کوائف بھیج دیتی ہیں۔ کارخانے کو مطلوبہ کاری گر مل جاتے ہیں اور کوئی خاص تگ و دو نہیں کرنا پڑتی۔

سنگاپور میں بھی یہی نظام بڑی کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ وہاں بھی مہاتیر کی طرح زیرک حکمران لی کیان لیؤ تھا، جس کو رچرڈ نکسن نے بھی اپنی کتاب لیڈرز میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ سنگاپور میں ہم تین روز رہے۔ شہر تو پہلے بھی کئی بار دیکھ چکے تھے البتہ کے وان وانظر نہ آیا۔ پتہ نہیں کمبخت کہاں مر گیا تھا۔ ہو سکتا ہے ترقی کے مدارج طے کرتا ہوا اب نیکسی کے بجائے کوئی قحبہ خانہ ہی چلا رہا ہو۔ وہاں سے ہم نے تھائی لینڈ کا ویزا لگوایا۔ جب ہم پاکستان سے چلے تھے تو ویزا کی ضرورت نہ تھی۔ ایئرپورٹ پر ہی لگ جاتا۔ سنگاپور پہنچے تو ایڈوائزر کی سیکرٹری کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ رولز اچانک بدل دیئے گئے ہیں اور پاکستانیوں کے لئے ویزا لگوانا ضروری ہے۔ ہمارے جن ملکوں کے ساتھ دوطرفہ معاہدے ہیں، وہ بھی آہستہ آہستہ کئی کترانے لگے ہیں۔ آرچرڈ روڈ پر رائل تھائی ایمبیسی ہے۔ انہوں نے کسی قسم کا تعرض نہ کیا بلکہ فوراً ویزے لگا دیئے۔ جرمن حکومت ان کی بھی مربی تھی۔

ہمدم دیرینہ سے ملاقات: ڈان مواتگ ایئرپورٹ سے باہر نکلیں تو مرکزی شاہراہ پر چڑھتے ہی ایک جہازی سائز کا بل بورڈ نظر آتا ہے جس پر جلی حروف میں لکھا ہے۔

Meet an old friend in Bangkok! Johnny Walker, Black Label.

مجھے بھی بنکاک میں ایک پرانے دوست سے ملنا تھا جو کالا لباس تو نہیں پہنتا تھا البتہ اس کی داڑھی کالی تھی۔ مہاراجہ امرجیت سے ایک طویل عرصے کے بعد ملاقات ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی کتاب میں ان کا خاکہ لکھا تھا جو ان تک پہنچ چکا تھا۔ انہیں پیشگی اطلاع دیئے بغیر میں بنکاک آیا تھا۔ بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے ''کم از کم مطلع تو کرتے میں خود ایئرپورٹ پر لینے آتا۔'' مزاج میں وہی شگفتگی، چہرے پر ویسی ہی تازگی، باتوں میں پرانی کھنک، کچھ فرق محسوس نہ ہوا البتہ وہ پرانی سیکرٹری موجود نہ تھی۔ دریافت کیا تو بھڑک اُٹھے۔ تم مجھ سے ملنے آئے ہو یا اس چھنال کے درشن کرنے۔ کم بخت بے وفا نکلی۔ برسوں کی رفاقت چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

''مجھے تو اس کا قصور کم اور آپ کی کمزوری زیادہ دکھائی دیتی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''ایک نوجوان منہ زور گھوڑی کو پرانے

تانگے میں جوت دیا جائے تو کیا نتیجہ نکلے گا۔ تانگے کے پچھلے اُکھڑنا شروع ہو جائیں گے۔ پہیے گھس کر ڈولنے لگیں گے۔"

"اب رنگ اور روغن کا ذکر نہ کرنا" وہ مسکرائے "یہ خالصہ اب بھی جوان ہے۔ دراصل وہ امیر آدمی تھا، اس کے دام میں آ گئی۔"

"تو آپ کون سے غریب ہیں۔ آپ کا شمار بنکاک کے متمول آدمیوں میں ہوتا ہے۔"

بولے "یہ بات نہیں۔ میں دراصل اپنے بوڑھے بیٹے جوش کی طرح حساب کتاب سے چلتا ہوں۔ یہ نو دولتیے ایک مرتبہ تو لاکھ لٹا دیتے ہیں اور پھر جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ ان معاملات میں جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینا چاہئے۔"

پوچھا "مشتاق خان مگسی کدھر ہے۔ اس سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

کہنے لگے "اچھا لڑکا ہے۔ بس ایک کمزوری ہے۔ جب بھی پاکستان سے کوئی وزیر شذیر آ جائے تو مگس کی طرح اس کے ساتھ نتھی ہو جاتا ہے۔ اس کی ڈائری میں ہر قابل ذکر ملاقاتی کے پتے ہیں۔ پاکستان جا کر ہر کسی کے در پر دستک دیتا ہے۔ اس روش کو تم ایک طرح سے اُس کی ہابی بھی کہہ سکتے ہو۔"

جب ان کی نئی سیکرٹری چائے لے کر آئی تو میز کی دراز کھول کر مجھے "سلگتے ساحل" دکھائی جس میں ان کا خاکہ تھا۔

بولے "تم نے مجھے امر کر دیا ہے۔ ہر لفظ سے پیار محبت اور شہد ٹپکتا ہے۔ یہ خالصہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سارے پاکستان میں وہ اس قدر مقبول ہو جائے گا۔ بے شمار لوگ مجھے اس کتاب کے حوالے سے ملے ہیں لیکن تم نے یہ کیا لکھ دیا ہے؟" وہ ایک سطر پر اُنگلی رکھتے ہوئے بولے "اندرا گاندھی کے قتل کے بعد سکھوں پر جو مظالم توڑے گئے اس حوالے سے میں نے ان کے تاثرات لکھے تھے۔ اب میں ہندوستان گیا تو کوئی نہ کوئی شدت پسند ہندو مجھ پر ضرور حملہ کرے گا۔" وہ خوف زدہ ہو گئے۔

"کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ اس ایک احتجاجی جملے نے مشرقی پنجاب کے خالصوں میں آپ کو کتنا مقبول کر دیا ہے۔ آپ چاہیں تو آسانی سے وہاں کے کسی حلقے سے بھی اسمبلی کا الیکشن جیت سکتے ہیں۔"

"آہو!" کہہ کر انھوں نے مجھے جپھا ڈال لیا "اوئے اے تاں سوچیا ای نئیں سی"

میں نے بچوں کا پوچھا تو آبدیدہ ہو گئے۔ کہنے لگے "برا ہو ویسٹی[1] کا جس نے مجھے انہیں امریکہ میں تعلیم دلانے کا مشورہ دیا۔ بیٹی ایک کرنٹے کو دل دے بیٹھی ہے اور نونہالوں نے داڑھی مونچھ صاف کروا لئے ہیں۔ کہتے ہیں ہم سے یہ ایکسٹرا بیگج نہیں اُٹھایا جاتا۔ ڈیڈی جب شام کو آپ کیس کھولتے ہیں تو بالکل بوڑھی عورت لگتے ہیں۔ کلجگ ہے، کلجگ!" مہاراجہ نے

۱۔ جنرل ویسٹ مور لینڈ

کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''واہ گورو نے پہلے ہی پیشین گوئی کر دی تھی کہ ایک ایسا وقت بھی آئے گا جب لوگوں کے ہاں ناخلف اولاد پیدا ہونے لگے گی۔''

''روم میں رہ کر رومنوں کا سا طرز تکلم اور رہائش اختیار کرنا پڑتی ہے۔ یہ بات تو آپ کو پہلے سوچنا چاہئے تھی۔ اب ہزار کوشش کر دیکھیں انہیں راہ راست پر نہیں لا سکتے۔''

''تم راہ راست کی بات کرتے ہو۔ وہ اُلٹا مجھے سمجھاتے ہیں۔ چھوٹا کہنے لگا ڈیڈی! زمانہ بدل گیا ہے۔ دُنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے، کیا آپ اپنی داڑھی سے ماضی کی راکھ نہیں جھاڑ سکتے؟''

مجھے ہنسی آ گئی۔ پھر آپ نے کیا کہا''میں نے اسے جھاڑ دیا۔ جی تو کرتا ہے اُنہیں عاق کر دوں پھر سوچتا ہوں کہ آخر ہیں تو میری ہی اولاد کسی گدھے کے بچے تو نہیں ہیں۔

مہاراجہ سے کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ انہیں پنجاب کی سبزیاں بہت پسند تھیں۔ اکثر پی آئی اے کے عملے سے منگواتے رہتے۔ مجھ سے بھی یہی فرمائش کی۔ یہ ایک عجیب طرح کا نسٹلجیا تھا۔ کہتے جب بھی میں پنجاب کی مولی، گاجر، شلغم اور بینگن کھاتا ہوں تو تصورات مجھے اپنے آبائی گاؤں مانانوالا لے جاتے ہیں۔ وہی گرد سے اَٹے ہوئے راستے، وہی چاچا امام دین کا گنڈا، وہ پاپیادہ سکول جاتے ہوئے تختیوں سے لڑنا، شرط بد کر نذیر کی کالی سیاہی کی پوری دوات ایک ڈیک میں پی جانا۔ وہ ماسٹر موتی لعل کا ہمیں روز مرغا بنوانا۔ آموختہ جو یاد نہیں رہتا تھا۔ بھلا لکن میٹی، کبڈی اور گلی ڈنڈہ کھیلنے والے بھی کبھی سبق یاد کرتے ہیں۔

شام کو مہاراجہ ہمیں ڈنر کھلانے شیرٹن ہوٹل لے گئے۔ مگسی اور شہزاد بھی ہمراہ تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور خالصہ چاولہ صاحب بھی تھے جن کے بنکاک شہر میں پراپرٹی کے کئی بلاک تھے۔ مہاراجہ ایسے موقعوں پر اس قسم کے لوگوں کو ضرور ساتھ رکھتے۔ آخر کسی نہ کسی نے بل بھی تو دینا تھا۔

لوکیشن کے اعتبار سے شیرٹن ہوٹل بنکاک کے خوبصورت ترین ہوٹلوں میں سے ایک ہے۔ دریائے چوفیہ کے کنارے پر پچیس منزلہ عمارت دامن نگاہ تھامتی ہے۔ بارھویں منزل پر انڈین فوڈ ریسٹورنٹ تھا جہاں پر ہم بیٹھے تھے۔ ہوٹل کی عقبی سیڑھیاں دریا کے اندر تک اُترتی تھیں۔ سیڑھیوں کے ساتھ، رسوں سے بندھے دو خوبصورت بجرے کھڑے تھے۔ دبیز قالین، سرخ مخملی سیٹیں، بار، یہ ہوٹل گیسٹس کے لئے مختص تھے۔

ہم ابھی سوپ پی رہے تھے کہ ایک نوجوان نہایت خوبصورت لڑکی کے ساتھ ریسٹورنٹ میں داخل ہوا۔ ان کے پیچھے دو دلال قسم کے لوگ تھے۔ چاولہ صاحب کو بڑے تپاک سے ملا۔ چاولہ نے ہمارا بھی تعارف کرایا۔ وہ تھائی ایئر کے چیئرمین کا اکلوتا بیٹا تھا جو ایک

ماڈل کو لے کر کھانا کھانے آیا تھا۔ وہ دوسرے ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ ہم بڑے غور سے ان کی حرکات و سکنات دیکھ رہے تھے۔ چاولہ بولا "بڑا عیشی پٹھا ہے۔ ہر شب ایک نئی عورت کے ساتھ گزارتا ہے۔ کہہ رہا تھا، کھانے کے بعد اسے اپنے فارم پر لے جاؤں گا۔ آدمی تو وہ چار تھے لیکن لگتا تھا کہ اس نے دس آدمیوں کے کھانے کا آرڈر دے دیا ہے۔ مٹن لیگ روسٹ، چکن تکے، سیخ کباب، مغلئی بریانی، کوفتے، مغز، پائے، پرانز، وہ دونوں فرانس کی مہنگی ترین شیمپین پی رہے تھے اور مسلسل ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔ کھانے کو ہاتھ تک نہ لگایا اس کے باوجود پلیٹیں صاف ہوگئیں۔ دلال اُن کی تہہ میں اُتر گئے تھے۔

کھانا کھا کر چاولہ نے جب بل منگوایا تو وہ تیس ہزار باٹ تھا۔ ہمیں بڑی حیرانی ہوئی۔ کیونکہ ہم نے تو اتنا کھانا نہ کھایا تھا۔

ہنس کر بولے "میں نے ان کا بل بھی اپنے بل میں شامل کرالیا ہے، بغیر بتائے ہوئے۔"

"وجہ؟"

"میں انہیں سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔"

"What a Surprise" شہزاد کے منہ سے بے ساختہ الفاظ نکلے۔

بنکاک کے انڈسٹریل زون میں جا کر صرف ایک بات کی حیرانی ہوئی۔ کئی پاکستانی سرمایہ کاروں نے بھی وہاں کارخانے لگا رکھے تھے۔ کارخانے کوریا، سنگاپور اور بنکاک میں، مکانات پارک لین لندن ہیں، بنک بیلنس سوس بنکوں میں محفوظ اور اقتدار کے مزے پاکستان میں۔ کون کہتا ہے یہ ملک غریب ہے، کون کہتا ہے ہمارا بال بال قرضوں میں جکڑا ہوا ہے، کون کہتا ہے کہ لوگوں کو پینے کا صاف پانی نہیں ملتا، علاج کے لئے دوائیں نہیں ملتیں۔ کھانے کو نان جویں کو ترستے ہیں، لباس چاک کی تہمتیں کون لگاتا ہے۔ آج جب آزادی کی راہ میں مارے گئے شہدا کی روحیں اس ملک کا طواف کرتی ہوں گی تو ضرور ان پر وجد طاری ہوتا ہوگا۔

بنگ کارنو کے دیس میں: ابھی ہمیں سہ ملکی دورے سے آئے ہوئے تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ انڈونیشیا سے بُلاوا آ گیا۔ وہاں کورین حکومت Productivity پر سیمینار کرانا چاہتی تھی۔ ایشیا کے بیس ممالک کے مندوبین کو مدعو کیا گیا۔ انڈونیشیا کی تاریخ تو شاید کم لوگوں کو معلوم ہو لیکن ملک کو ہر پاکستانی جانتا ہے۔ جب ۶۵ء کی جنگ شروع ہوئی تو صدر سوئیکارنو نے اپنی نیوی کی خدمات پیش کی تھیں۔ دونوں ملک قریباً ساتھ ساتھ آزاد ہوئے۔ ہزاروں جزیروں پر پھیلے ہوئے اس دیوہیکل ملک پر جس طرح ولندیزیوں نے آسانی سے قبضہ کر لیا وہ بھی تاریخ عبرت کا المناک باب ہے۔ انگریز ازخود ہندوستان سے نکل گیا۔

ولندیزیوں کو سوئیکارنو اور اس کے ساتھیوں نے نکال باہر کیا۔ وہ ایک انقلابی لیڈر تھا لیکن ساتھ ہی اکثر مسلمان حکمرانوں کی طرح دل پھینک بھی تھا۔ جہاں کہیں کوئی خوبصورت لڑکی دیکھتا، شادی کی دعوت دے ڈالتا۔ آزادی کے بعد اس نے دو ہی شوق پال رکھے تھے۔ خوبصورت عورتوں سے دوستی اور رنگ برنگی وردیاں پہننا۔ ایک دن فوجی یونیفارم میں باہر نکلتا تو دوسرے روز نیوی اور ایئر فورس کی وردی زیب تن کر لیتا۔

سامراج دشمنی اس کے خمیر میں تھی۔ آزادی کی راہ میں بڑی تکلیفیں بھی اُٹھائی تھیں اس لئے وہ کمیونسٹ ممالک کے قریب ہوتا گیا۔ دھونس، دھاندلی اور جبر چونکہ کمیونسٹ فلاسفی کا حصہ ہیں اس لئے لوگ آہستہ آہستہ برگشتہ ہوتے گئے۔ جب انقلاب آیا تو کوئی کمیونسٹ زندہ نہ بچا۔ ٹائم میگزین نے لکھا:

To be known Communsit was usually to become a dead Communist.

تطہیر کے اس عمل کے بعد وہ عملاً کنارہ کش ہو گیا اور کمان فوج کے سالار سوہارتو نے سنبھال لی۔ انڈونیشیا میں ملائشیا کی طرح دیسے تو کئی مذاہب کے لوگ آباد ہیں لیکن وہاں بھی واضح اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ دارالحکومت جکارتا ہے لیکن خوبصورت ترین علاقہ بالی ہے۔ دنیا کا ہر سیاح وہاں جاتا ہے۔ ہزاروں نوجوان جسم، نیم برہنہ حالت میں ڈین پسار کے ساحل پر لیٹ کر غسل آفتابی کرتے ہیں۔ سیاحوں کی اکثریت آسٹریلیا امریکہ اور یورپ سے آتی ہے۔ جزیرہ بالی میں ہندو کافی تعداد میں بستے ہیں۔ اس کے کلچر میں ہندو مذہب کی چھاپ صاف دکھائی دیتی ہے۔

میں نے سوچا کہ سیمینار سے چند روز قبل بالی کی سیر کی جائے۔ ٹریول ایجنٹ نے بتایا کہ بالی جانے کے دو راستے ہیں۔ بنکاک سے براہ راست فلائٹ بالی جاتی ہے جو ہے تو نزدیکی راستہ لیکن مہنگا ہے۔ دوسرا راستہ براستہ جکارتا ہے جو طویل مگر سستا ہے۔ مجھے کوئی حیرانی نہ ہوئی۔ ایئر کمپنیوں کا اپنا طریق کار ہے۔ کسی زمانہ میں پاکستان سے امریکہ جانے کا کرایہ کم تھا اور لاہور سے لندن مہنگا پڑتا تھا۔

مجھے تین دن بالی رہنا تھا۔ اس لئے تھائی ایئر کے توسط سے ہوٹل کی ایڈوانس بکنگ کرالی۔ لاہور سے بنکاک گیا اور وہاں Connecting flight لے کر جکارتا پہنچ گیا۔ خاصا تھکا دینے والا سفر تھا وہاں سے بھی لوکل فلائٹ لے کر بالی جانے والے جہاز پر سوار ہو گیا۔

جہاز میں میرے ساتھ جو شخص بیٹھا تھا وہ بالی کا رہنے والا تھا۔ وہ پینٹر تھا اور جکارتا میں اپنی تصویریں بیچ کر واپس جا رہا تھا۔ اس نے بالی کے متعلق کافی معلومات فراہم کیں۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے

بتایا کہ میں سرکاری ملازم ہونے کے علاوہ ایک سفرنامہ نگار بھی ہوں اور چند دنوں کے لئے بالی کے حسن سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ کہنے لگا ''تم نے اپنا تفصیلی تعارف نہیں کرایا۔'' میں اپنا تعارف کراتے کراتے اسے تاریخ کے جہنم زار میں لے گیا۔ اسے بتایا کہ کس طرح برصغیر کے مسلمانوں نے ایک آزاد مملکت کے لئے جدوجہد کی کیسے ایک خون کا دریا عبور کر کے ہم آزادی کی منزل تک پہنچے۔ ہندوؤں کے تعصب، مظالم اور تنگ نظری کا بالخصوص ذکر کیا۔ وہ بڑے انہماک سے داستانِ غم سنتا رہا۔ جب جہاز بالی ایئرپورٹ پر اُترنے لگا تو میں نے پوچھا ''آپ نے اپنا کام تو بتا دیا ہے نام نہیں بتایا۔''

مسکرا کر کہنے لگا ''میں بالی کا ہندو ہوں اور میرا نام رام داس ہے۔''

جب ہم بیگج لینے مرکزی ہال میں پہنچے تو معاً مجھے خیال آیا کہ ہوٹل کی ریزرویشن سلپ تو پاکستان چھوڑ آیا ہوں۔ ہوٹل کا نام تک مجھے یاد نہیں تھا۔ اُس سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو کہنے لگا ''میں بالی کے بڑے ہوٹلوں کا نام لیتا ہوں۔ شاید تمہیں یاد آ جائے اُس نے ایک ایک کر کے سب قابل ذکر ہوٹل گنوا ڈالے لیکن یادداشت نے ساتھ نہ دیا۔ کہنے لگا ''مجھے افسوس ہے لیکن میں تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتا۔ تمہیں باہر نکل کر از سرِ نو کسی ہوٹل کی بکنگ کرانا ہوگی جو خاصی مہنگی پڑے گی۔ وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر باہر چلا گیا اور میں سامان لینے کے لئے وہیں ٹھہر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بھاگتا ہوا آیا کہنے لگا ''گڈ لک مسٹر شاہ! گڈ لک۔ باہر ہوٹل کا نمائندہ کارڈ لئے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔''

جب کوچ میں بیٹھ گئے تو نمائندے نے ریزرویشن سلپ مانگی۔ میں نے جب قصہ غم سنایا تو کہنے لگا ''نو پرابلم'' ہوٹل چلتے ہیں۔ اگر تصدیق ہوگئی تو ٹھیک نہیں تو تمہیں مزید رقم خرچ کرنا پڑے گی۔ ہوٹل کا منیجر خاصا مددگار ثابت ہوا اُس نے تھائی ایئر کو ٹیلکس بھیجا اور انہوں نے میری ریزرویشن کنفرم کر دی۔ میں بہت تھکا ہوا تھا۔ ایک رات اور پورا دن سفر میں کٹ گیا تھا، جلد سو گیا۔

علی الصبح حسب دستور اُٹھ کر جاگرز پہنے اور سیر کے لئے نکل گیا۔ بالی میں جتنے بڑے ہوٹل ہیں وہ Nusa beach پر ہیں۔ شفاف سمندر اور ہوٹلوں کے درمیان دو تین سو گز کا فاصلہ ہے جہاں نرم سفید ریت ہے۔ سیاح اپنے کمرے کی کھڑکیوں سے حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے سمندر کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ سوئمنگ کے لئے دور چل کر نہیں جانا پڑتا۔ کاسٹیوم پہنا اور ہوٹل کے عقبی دروازے سے نکل کر بیچ تک پہنچ گئے۔

سوچا آج کسی پارک یا جوگنگ ٹریک پر چلنے کے بجائے بیچ پر ہی واک کر لی جائے۔ ابھی میں ہوٹل سے نکلا ہی تھا کہ مجھے پیچھے سے کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ مڑ کر دیکھا تو خوشگوار

حیرت ہوئی۔ ایک نہایت حسین وجمیل لڑکی سنہری بال بکھرائے برہنہ پا سوئمنگ کاسٹیوم پہنے میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ خوبصورت چہرے تو اکثر نظر آ جاتے ہیں، انتہائی متناسب بدن کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہر عضو شاعری کرتا ہوا۔ مجھے ایک لمحے کے لئے یوں محسوس ہوا جیسے میں بالی کے بجائے کسی گمنام جزیرے میں نکل آیا ہوں، ساحل پر پرشکوہ عمارتیں نہیں کھڑیں بلکہ ناریل کے جھنڈ ہیں۔ پرنم ہواؤں کے لمس میں ایک سندیسہ ہے۔ واضح پیغام ہے، کھلا اشارہ ہے۔ چار سو سوسنوں کی خوشبو ہے۔ من موجی سمندر بڑی حیرت اور حسرت سے تک رہا ہے۔ وہ حسینہ بھی اسی تباہ شدہ جہاز کی مسافر ہے جس کے تختے پر بیٹھ کر ہم یہاں پہنچے ہیں اور میرا نام سندباد جہازی ہے۔ الف لیلیٰ نے صدیوں تک لوگوں کے ذہنوں کو آسودگیاں بخشیں۔ قصوں اور کہانیوں کی شہزادی کتابوں سے نکل کر حقیقی زندگی میں آ گئی تھی۔

"ہیلو" کہہ کر اس نے لبوں پر ایسی مسکراہٹ بکھیری جسے اس کے حسن کا خلاصہ کہا جا سکتا تھا۔ مغربی کلچر میں ہیلو کا جواب ہائے سے دیا جاتا ہے۔ میں نے بھی ہائے کہا لیکن وہ انگریزی ہائے نہیں بلکہ مرزا غالب والی ہائے، ہائے تھی۔

بولی "میں بھی اسی ہوٹل کی گیسٹ ہوں۔ سوئمنگ کے لئے نکلی ہوں۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"مجھے جوگنگ کرنا ہے"

"سفید ریشمی ریت پر جوتے پہن کر جوگنگ؟ یہ کفران نعمت ہے۔ اگر تم آسٹریلیا میں ہوتے تو ہو سکتا ہے تمہارا چالان ہو جاتا۔" اب کے وہ کھل کر مسکرائی

"میں کچھ سمجھا نہیں"

بولی "اب اس میں سمجھانے والی کون سی بات ہے۔ پہلے تو ریت پر دوڑا نہیں جا سکتا۔ پاؤں دھنس جاتے ہیں اور ریت جوتوں میں گھس کر کچکچاہٹ پیدا کرتی ہے۔ جوگرز پہن کر دوڑنا تو کجا چلنا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔ پھر You will be the odd man out ہر کوئی تمہاری طرف حیران کن نظروں سے دیکھے گا۔"

"لیکن میں نے بانڈے بیچ میں دو بوڑھے میاں بیوی کو ساحل پر دوڑتے ہوئے دیکھا ہے۔"

بولی "کیا انہوں نے جوگرز پہن رکھے تھے؟"

"نہیں تھے تو ننگے پاؤں لیکن دوڑ رہے تھے۔"

"تم وہاں کیا کرنے گئے تھے؟"

"میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز میں پڑھ رہا تھا۔"

"اوہ- Really" اس نے ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ ہاتھ ملاتے ہوئے بولی "میں ٹریسی ہوں۔ تمہارا نام کیا ہے۔ اس اعتبار سے تو تم بھی نیم آسٹریلین ہو۔"

"اگر نہیں بھی تھا تو اب بننے کو جی کرنے لگا ہے"

وہ میرے لہجے کی شرارت کو بھانپتے ہوئے

بولی ''ضرور بنو مگر ایک شرط ہے۔ آئندہ جوگرز پہن کر کبھی بیچ پر مت آنا۔''

''میرا نام شاہ ہے۔ میں پاکستان میں سرکاری ملازمت کرتا ہوں۔ جکارتا میں سیمینار ہے سوچا چند دن بالی میں گزارے جائیں۔''

بولی ''میں بھی ایک ہفتے کے لئے آئی ہوں۔ ماڈلنگ کرتی ہوں۔ کسی فارماسوٹیکل کمپنی کے لئے چند شاٹس دینے تھے، اس لئے ہم یہاں آئے ہیں۔''

''سڈنی کی Beaches تو تمام دنیا میں مشہور ہیں۔ بانڈے، منیلی، کنولا اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''شاٹس بیچ پر نہیں بلکہ کوہ اُگانگ کی چوٹیوں پر لئے گئے ہیں۔ یہ وہی پراسرار پہاڑ ہے جس کی گھپاؤں میں بیٹھ کر بالی کے منجم اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ ستاروں کی گردش سے آنے والے واقعات کے متعلق پیشین گوئیاں کرتے ہیں۔''

''کیا وہ درست ثابت ہوتی ہیں؟''

''بالکل۔ حرف بہ حرف۔ آج سے کئی سال پہلے Ikya Saki Comet کو دیکھ کر انہوں نے بتایا تھا کہ انڈونیشیا میں خاک اور خون کی ہولی کھیل جائے گی۔ نتیجتاً انقلاب میں لاکھوں لوگ مارے گئے جن میں اکثریت کمیونسٹوں کی تھی۔''

''کمال ہے تم پڑھی لکھی ہو کر ان باتوں پر یقین کرتی ہو؟ ستارہ کسی شخص کی قسمت کا حال کیا بتائے گا وہ تو خود گردش افلاک میں خار و زبوں ہے۔'' میں نے علامہ اقبال کا دامن پکڑ لیا۔ شعر تو نہ پڑھا البتہ ترجمہ کر ڈالا۔

بولی ''مسٹر شاہ! اس کا تعلیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انسان مجبور محض ہے جو اپنے مقدر کی شکستہ کشتی پر سوار ہے۔ حالات کی بے رحم موجیں اُسے جدھر چاہیں لے جاتی ہیں۔ کیا تمہیں علم ہے کہ سایکارنو جیسا انقلابی لیڈر بھی سخت توہم پرست تھا۔ جو شخص ساری زندگی گولیوں کی تڑتڑاہٹ میں بے خوف آزادی کی جنگ لڑتا رہا وہ جراح کے نشتر سے ڈرتا تھا۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں؟''

''سوئیکارنو بھی بڑا Superstitious تھا۔ اسے بالی کے انہی Mystic Prophets نے بتایا تھا کہ اس کی موت نشتر سے واقع ہو سکتی ہے۔ ساری عمر درد گردہ میں مبتلا رہا لیکن آپریشن کروا کر گردے سے پتھر نہ نکلوایا۔''

ہم چلتے چلتے کافی دُور نکل گئے۔ مجھے اچانک احساس ہوا کہ اس نے غسل تو کیا ہی نہیں ہے۔ میں نے اسے یاد دلایا تو بولی ''اب سورج نکل آیا ہے، کچھ مزہ نہیں آئے گا۔ چلو واپس چلتے ہیں۔''

''میں تو سورج کو سمندر سے نکلتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ دیکھو کس قدر بے تاب نظر آتا ہے۔''

[جاری ہے۔]

غزل

دم سادھ کے دیکھوں تجھے، جھپکوں نہ پلک بھی
آنکھوں میں سمولوں، ترے لہجے کی دمک بھی

اے عشق! اگر مجھ کو ترا اذن ہو ممکن
آغوش میں لے لوں، ترے پیکر کی مہک بھی

اے ذکر! مرے فکر کی تقدیر بدل دے
اے نور! مرے نطق کے کاسے میں چھنک بھی

اے قطرۂ خون مصحفِ رخسار پہ تل بن
اے سطرِ تپاں! کاغذِ سادہ پہ دہک بھی

دل عرضِ ہنر ہے تو بدن ارضِ ہنر ہے
اے میرے دلِ سادہ، مرے تن میں دھڑک بھی

اے فرطِ ارادت، پسِ مژگاں نہ سسک اب
اے حسنِ محبت مری آنکھوں سے چھلک بھی

یہ رنگ مرے نور میں رکھے ہیں اسی نے
گندھوائی تھی جس نے مری مٹی میں کھنک بھی

اس شہر کی جانب مرے پاؤں نہیں اُٹھتے
اس دل سے وہی دور کرے گا یہ جھجک بھی

کیا میں نے کیا ہے کہ سزاوارِ ردا ہوں
مجھ کو تو بہت ہے تری کملی کی جھلک بھی

خالد احمد

غزل

خلق پر اپنے تئیں کتنا کرم کرتے ہو
ظلم جس دن ذرا معمول سے کم کرتے ہو

بستیاں ڈھیر بناتے ہو بموں سے اور ادھر
مرگِ سگ پر بھی بہت آنکھ کو نم کرتے ہو

دھڑکنیں دہر کی دُھن ساتھ ملانے والو
زمزمِ دل، سمِ قاتل سے بہم کرتے ہو

یہ حویلی کہ جو باطل کو بہت کھلتی ہے
کن بہشتوں کے لیے اس کو بھسم کرتے ہو

صاف دِکھتا ہے کہ شفّاف نہیں ہے نیّت
جس شتابی سے کہ تم قول و قسم کرتے ہو

اس قدر یاس طرازی کہ سرِ حرف و نوا
صبحِ جاں تاب کو بھی شامِ الم کرتے ہو

جس سے لمحوں پہ زمانوں کو لکھو ہو عالی
دَم وہ کیا اسم سرِ نوکِ قلم کرتے ہو

جلیل عالی

غزل

سردار تو دستار بچانے میں لگے ہیں
اور ہم در و دیوار بچانے میں لگے ہیں

یہ ارضِ وطن کا کہیں سودا ہی نہ کر دے!
ہم جس کو لگاتار بچانے میں لگے ہیں

ڈرتے ہیں کہیں لوٹ نہ لے راہ میں کوئی
سودے کو خریدار بچانے میں لگے ہیں

دیوار گرانے پہ مُصِر سارے محافظ
ہم سایۂ دیوار بچانے میں لگانے ہیں

تمثیل کسی وقت بدلنے ہی لگی ہے
اور چند اداکار بچانے میں لگے ہیں

ہتھیار نہیں ڈالیں گے ہرگز کبھی ہم تو
ہم قلعۂ مسمار بچانے میں لگے ہیں

وہ ہاتھ قلم کرنے پڑے بھی تو کریں گے
جو ڈولتی سرکار بچانے میں لگے ہیں

کشتی کو ڈبویا ہے سمندر میں جنہوں نے
ٹوٹے ہوئے پتوار بچانے میں لگے ہیں

قارون بھی شرمندہ انہیں دیکھ کے ہوگا
جو درہم و دینار بچانے میں لگے ہیں

نسیمِ سحر

غزل

عجیب صورت گری ہوئی ہے
بنائے تعمیر گر گئی ہے

کبھی مقدم تھی پیش قدمی
جو راہ پسپائی پر کھڑی ہے

درِ اعانت پہ دستکیں ہیں
کھنکتا کشکول جانکنی ہے

ہر اک سناتا ہے عیش بینی
پر آہ دلگیر ان سنی ہے

مہیب خطروں کی یورشیں ہیں
ہر ایک کی جاں پہ آ بنی ہے

نگفتنی سب حکایتیں ہیں
زوالِ احوال دیدنی ہے

ہجوم کی خنجر آزمائی
جو کھیت جسموں کے کاٹتی ہے

محافظوں کی ہے آنکھ میلی
نگاہِ غاصب سے دوستی ہے

ہے دم بخود یہ ریاض میرا
درونِ سینہ جو کھلبلی ہے

سید ریاض حسین زیدی

غزلیں

کچھ تیر کے باعث ہے نہ تلوار کے باعث
مَیں کٹ کے گرا اپنی ہی گفتار کے باعث

کوتاہ قدوں پر تو عنایت کی نظر ہے
مجھ پر ہے ستم قامتِ دستار کے باعث

سب کو مِلا چپ رہنے پہ انعام میں خلعت
مَیں مارا گیا جرأتِ اظہار کے باعث

کچھ طائرِ خوابیدہ سے شکوہ نہیں اُن کو
جھگڑا ہے مِرے دیدۂ بیدار کے باعث

کھینچی تھی جو رُخ موڑنے کے واسطے خاورؔ
سیلاب در آیا اُسی دیوار کے باعث

خاور اعجاز

تھل صحرا میں رات گزاری اور مقتل میں صبح
اِک کربل میں شام ہُوئی اور اِک کربل میں صبح

سیرِ جہاں کے بعد ہمیں بس اِتنا یاد رہا
جنگل ہی میں رین گذاری اور جنگل میں صبح

شہر کی سڑکوں پر دیکھے ہیں ایسے لاغر جسم
جاڑوں کی راتوں میں کرتے اِک کمبل میں صبح

دو پل ہی کا میلہ تھا لیکن اِس جیون میں
پچھلے پل میں شب کا سماں تھا، اگلے پل میں صبح

یہ تو بے گھر لوگوں کی مجبوری ہوتی ہے
اِک ہوٹل میں شب کاٹی دو جے ہوٹل میں صبح

اِک دو گھونٹ بچے ہوتے تو کوئی بات بھی تھی
کون کرے خاورؔ صاحب خالی بوتل میں صبح

غزل

نجانے کیوں مجھے ایسا لگا ہے
ہمارے درمیاں کوئی کھڑا ہے

تمھیں دیکھے کئی دن ہو گئے ہیں
تمی کہہ دو ، کبھی ایسا ہوا ہے

ہر اک منہ میں زباں رکھتا ہے لیکن
کوئی گونگا ہے ، کوئی بولتا ہے

سبھی چہرے ہیں میرے دیکھے بھالے
نہ پوچھو کون کتنا پارسا ہے

یہ سائیں سائیں کرتا دشت روہی
خبر دیتا ہے پنّوں جا چکا ہے

تحیّر سے کبھی نکلو تو کہنا!
اگر تم نے مجید امجد پڑھا ہے

یہ کیسی بدگمانی ، زود رنجی
بتاؤ تو سہی کیا مسئلہ ہے

محمد انیس انصاری

غزل

میرے رستے میں روایات سے انکار کے بعد
ایک دیوار اٹھا دی گئی دیوار کے بعد

تاج پہناتے ہیں کانٹوں کا چڑھا کر سولی
ہے یہی ریت پرانی یہاں دستار کے بعد

اے وطن وہ بھی ترے قدموں میں لا کر رکھ دیں
گر لٹانے کو بچا کچھ بھی ہو گھر بار کے بعد

کیسے تعمیر کیا جائے وہاں کچھ کہ جہاں
توڑنے والے چلے آتے ہوں معمار کے بعد

وہ حویلی ہوں جسے چاٹ گئی ہے دیمک
نخوت و ناز و ادا حشمت و پندار کے بعد

پھر کسی اور طرف اٹھتی نہیں آنکھ سے آنکھ
اس کے چہرے سے پھسل کر لب و رخسار کے بعد

تو بھی اک ایسی بے تصدیق خبر ہے راحت
جو ضمیموں میں چھپا کرتی ہے اخبار کے بعد

راحت سرحدی

غزل

میں خود پسند تھا تنہا تھا سب سے جوڑ دیا
بچھڑنے والے ترے غم نے رب سے جوڑ دیا

مرے رفیق میں بے وجہ زندہ تھا اب تک
تری عطا ہے کہ مجھ کو سبب سے جوڑ دیا

میں اپنا درد لکھوں یا اسی کا غم لکھوں
وہ ایک شخص کہ جس نے ادب سے جوڑ دیا

فراق میں نہیں دن رات کی کوئی تفریق
پھر آج کس نے مجھے روز و شب سے جوڑ دیا

ستم تو یہ ہے کہ ناگفتنی وہی ٹھہرا
مری زباں کو رضیؔ جس نے لب سے جوڑ دیا

صفدر صدیق رضی

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

جنگ دو گز زمین کی خالد
ہم نے اک عمر لڑ کے ہاری ہے

غزل

پھر مری جاں پہ آج بن آئی
پھر مرا دل ہوا ہے سودائی

حال دل کیا اُسے سناؤں میں
وہ کہاں اور کہاں مسیحائی

اور ہونگے جنھیں گوارا ہے
آستاں آستاں جبیں سائی

کیا بچا ہے تمھارے بعد یہاں
زندگی کیوں اِدھر چلی آئی

ہم نے ساجدؔ فقط اُدھر دیکھا
اُن کی صورت جدھر نظر آئی

سید افسر ساجد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لڑ کھڑا کر دم نہ دے دیں ڈگمگاتی دوریاں
دل میں بجھتی لو کی صورت کپکپاتی دوریاں

غزل

اندھیری شب میں اُس کے نور کی ترسیل ہو جاؤں
چھپے سورج کی خاطر چاند کی تمثیل ہو جاؤں

بشارت قرب منزل کی ملے مرے حوالے سے
اگر پتھر ہی کہلانا ہے سنگِ میل ہو جاؤں

مرے افکار کی لہریں کریں سیراب ذہنوں کو
خرد کی برف پگھلے آگہی کی جھیل ہو جاؤں

کسی ایوان کی جگمگ بڑھا دینے سے بہتر ہے
کہیں ظلمت گزیدوں کے لیے قندیل ہو جاؤں

پریشاں خواہشوں کو شکل دوں مربوط سوچوں کی
شکستوں کی فضا میں جیت کی تشکیل ہو جاؤں

مراسم کے لیے اب رہ گئی ہے ایک ہی صورت
بدل سکتا نہیں سب کو تو خود تبدیل ہو جاؤں

جلاتا ہے کوئی نادان ہی اپنے ٹھکانے کو
میں کیوں اس نامناسب حکم کی تعمیل ہو جاؤں

نہیں خواہش بنوں مقراض رشتے کاٹنے والی
تعلق جوڑنے والی سنہری کیل ہو جاؤں

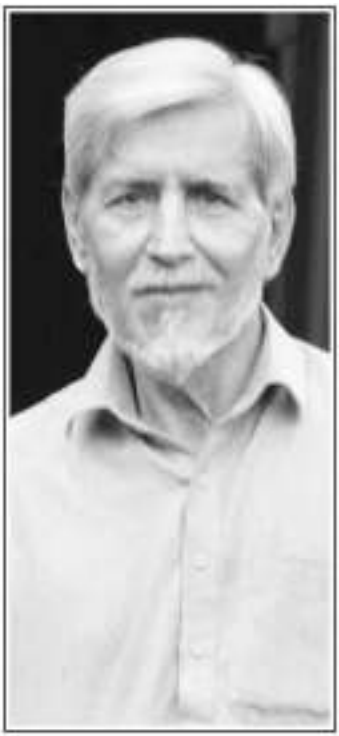

گلزار بخاری

غزل

سرد رت کی اداس تنہائی
جانے کب سے لگائے بیٹھی ہے
بے سبب رنج ، یاس، تنہائی
تیرے ملنے کی آس ، تنہائی

اور کوئی نہیں ہے کوئی نہیں
کوئی دکھ بھی نہیں مگر باقی
صرف ہے غم شناس تنہائی
میرے دل کو ہے راس تنہائی

زرد موسم میں خوب پھلتے ہیں
پیلی سرسوں ، کپاس ، تنہائی

سالِ نو میں عروج پر ہوں گے
ظلم ، خوف و ہراس ، تنہائی

یاد آتی ہیں جھیل سی آنکھیں
بڑھتی جاتی ہے پیاس تنہائی

گرتے پتے شجر سے کہتے ہیں
اب ہے تیرا لباس تنہائی

دور جاتی نہیں مرے دل سے
ہے یہیں آس پاس تنہائی

باقی احمد پوری

غزل

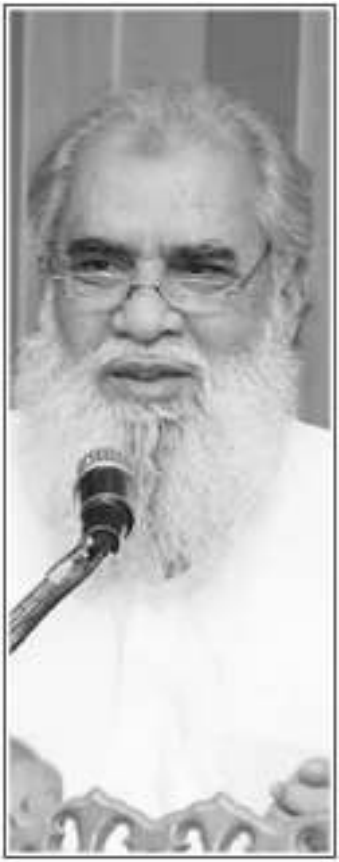

آؤ کریں یہ وعدہ سبھی، بھولنا نہیں
اک دوسرے کو ہم نے کبھی، بھولنا نہیں

ممکن ہے بھول جائے کبھی ایک عمر بعد
بیکار کھپ رہا ہے ابھی، بھولنا نہیں

رکھ لینا لاج قبر میں، میدانِ حشر میں
اس امتی کو میرے نبی، بھولنا نہیں

اس معرکے میں ہم نے اٹھائے ہیں لاکھ زخم
یہ معرکہ بھی ہم کو کبھی، بھولنا نہیں

رکھنا ہے یاد، کلمۂ توحید لاالہ
کہتے ہیں مجھ سے میرے نبی، بھولنا نہیں

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

غم فراہم ہیں مگر ان کی فراوانی نہیں
اے گراں جانی، یہاں کوئی بھی آسانی نہیں

غزل

جو بھی پتھر سے جا ملا ہو گا
زخم گہرا اُسے لگا ہو گا

لب کشائی کا شوق تھا جس کو
اُس نے خاموش کر دیا ہو گا

اِس لیے بار بار چونکتا ہے
میرا دشمن نیا نیا ہو گا

سب کی آسان زندگی ہو گی
کون میری طرح جیا ہو گا

جانے والے نے مُڑ کے دیکھا مجھے
کچھ نہ کچھ وہ بھی سوچتا ہو گا

میں بھی گر جاؤں گا تھکاوٹ سے
وقت بھی ہوش کھو چکا ہو گا

جس نے اقبال تجھ کو چھوڑ دیا
کب کسی اور کا ہُوا ہو گا

اقبال سروبہ

غزل

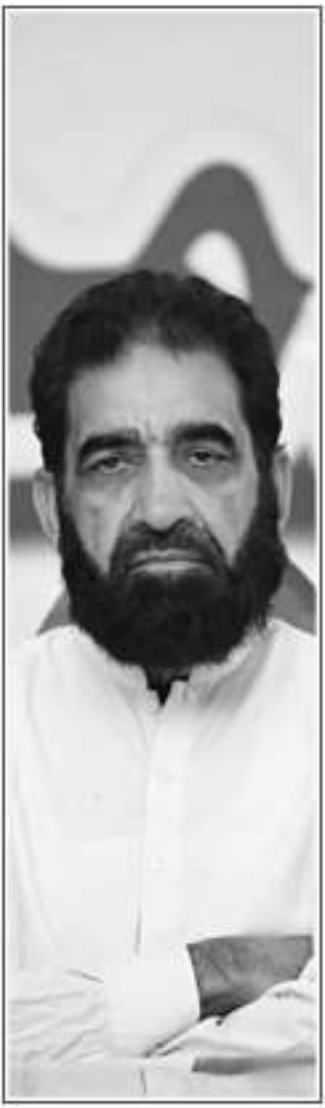

دھندلا گیا ہے آنکھ میں گو روئے یار بھی
لیکن ابھی ہے رقص میں زریں غبار بھی

عجز و نیاز نے مجھے رسوا کیا کچھ اور
لہجے سے میرے افشاں تھا میرا خمار بھی

اس دل کو دھو رہا ہوں میں اشکوں سے بار بار
اس نے کیا قبول دل داغدار بھی

دونوں کے رنگ اپنے ہیں اور بے بہا بھی ہیں
اپنے لئے ہے ایک خزاں بھی بہار بھی

لاتقنطو کے ساتھ شفاعت کی ہے امید
آخر کہیں تو ہو گا ہمارا شمار بھی

میں کیا کروں کہ پھر بھی اداسی نہیں گئی
گو وقت میرے واسطے تھا سازگار بھی

لاہور ہے پتہ مرا اور سعد میرا نام
ہے ساتھ سبزہ زار کے اک مرغزار بھی

سعد اللہ شاہ

غزل

منظر سب وہ خواب ہوئے
کمیاب و نایاب ہوئے

عشق میں کم ہی پار اترے
کتنے تو غرقاب ہوئے

لہروں نے ہم کو دیکھا
ساحل تک گرداب ہوئے

زہر آلود ہیں اب سانسیں
آنسو ہیں ، زہراب ہوئے

عمر کٹی تارے گن گن
پھر بھی خاک ، حساب ہوئے

چشمِ نم اور چشمۂ دل
دونوں ہی بے آب ہوئے

دل سے دل کی بات چلی
نظروں سے آداب ہوئے

ذکر جہاں بھی اُن کا ہو
روشن سارے باب ہوئے

پیار میں راتیں کٹتی نہیں
دن بھی اپنے عذاب ہوئے

خدّ و خال و رنگ و ادا
ہم کو مثلِ نصاب ہوئے

عزم سے پربت سرک گئے
دریا بھی پایاب ہوئے

خود ہی رستے بنتے گئے
غیب سے جب اسباب ہوئے

خالدہ انور

غزل

ویسے تو اسے پیار سے انکار نہیں ہے
لیکن وہ ابھی صاحبِ اقرار نہیں ہے

مانگی جو کبھی ہاتھ پکڑنے کی اجازت
وہ سوچ کے بولی! مجھے انکار نہیں ہے

یہ وصل کا تہوار بھی کچھ دن ہی رہے گا
یہ ہجر کا موسم بھی لگاتار نہیں ہے

اس شخص پہ جنت کبھی واجب نہیں ہوگی
جو شخص محبت کا گنہگار نہیں ہے

جس درجہ ترے وصل کی جھیلی ہے اذیت
اس درجہ ترے ہجر کا آزار نہیں ہے

آتا ہی نہیں دل کو دھڑکنے کا سلیقہ
کمبخت ابھی اتنا سمجھدار نہیں ہے

جلتے ہوئے ماتھے پہ اگر ہاتھ وہ رکھے
بیمار بھی لگتا ہے کہ بیمار نہیں ہے

اس پھول سے اپنی بھی حفاظت نہیں ہوتی
جس پھول کے پہلو میں کوئی خار نہیں ہے

سردار بنا دیں یا سرِ دار سجا دیں
یاروں کی کسی بات سے انکار نہیں ہے

افتخار شاہد

غزل

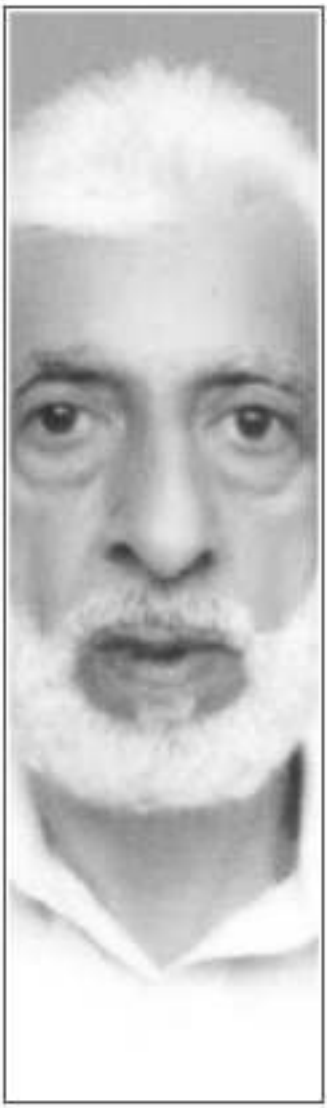

غضب کی دُھوپ میں سائے اُگا کے دیکھیں گے
سُلگتے جسموں پہ مرہم لگا کے دیکھیں گے

سحر کا فاصلہ کیا ہے شبِ اماوس سے
چراغ جِھنے کا ہم بھی جلا کے دیکھیں گے

مِلا ہے جِس کو بھی نفرت کا زہر ورثے میں
ہم اُس کو پیار کا امرت پلا کے دیکھیں گے

ضمیر زِندہ ہے اُس کا کہ مر چُکا یارو
فقیہِ شہر کو شیشہ دِکھا کے دیکھیں گے

سکُونِ قلب کا ہوتا ہے ذائقہ کیسا
کسی کی راہ سے پتھر ہٹا کے دیکھیں گے

کِھلیں گے پُھول خزاں میں نئی اُمیدوں کے
حضُورؐ جب بھی ہمیں مُسکرا کے دیکھیں گے

تنی ہوئی ہے جو گردن غُرور سے شاہد
اُسے زمین کی جانب جُھکا کے دیکھیں گے

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

معجزہ ہوا ہوتا ہجر ٹل گیا ہوتا
تو بدل گیا ہوتا میں بدل گیا ہوتا

ہم نظام کے قیدی قدغنیں مقدر ہیں
نفرتوں کا پھٹ کے لاوا اچھل گیا ہوتا

میری بے کسی کا اس کو خیال آ جاتا
پرسکون ہو کر یہ دل سنبھل گیا ہوتا

وقت اس طریقے سے تو گذر نہیں سکتا
خامشی سے میری پیغام مل گیا ہوتا

مار آستیں کے وجہِ شکست تھے ورنہ
میں سمیت تیرے لشکر کچل گیا ہوتا

فیض کی طرح تو بھی جیل میں پڑا ہوتا
جو سنا کے ویسی کوئی غزل گیا ہوتا

میں امام اس کی نظروں میں جب برا تھا پھر
انتظار کیوں کرتا تھا نکل گیا ہوتا

مظہر امام

غزل

دزدیدہ سی، ایک نظر سے، کیا کیا خواب سجایا ہم نے
ریزہ ریزہ سے منظر کو، دیکھ؛ کیا، سرمایہ ہم نے

دل آنکھیں، شاداب کرے ہے، کیا ہی غضب ترے حسن کی رونق
دیکھ اِدھر، تجھ سبز نمو سے، کیا کیا باغ لگایا ہم نے

روپ نگر کے رہنے والو، تم نے کب دیکھا یہ رستہ
تھک تھک ہارے کہنے والے، قول یہی دوہرایا ہم نے

شعلہ صفت تھا عشق ہمیشہ، کیا اس میں انگار ہوا دل!
ہے یہ دعویٰ خوب کسی کا "آگ میں پھول کھلایا ہم نے"

خود جو الجھے ہیں اب واعظ، آتے جاتے سب سے پوچھیں
کار عجب نہیں، دل کا آنا، ایسا کیا فرمایا ہم نے؟

اپنے چہرے کو پہچانو، دہر کے آئینہ خانے میں
پیٹھ پہ اس نے وار کیا ہے، جس کو دوست بتایا ہم نے

مدِ مقابل دیکھ کے اپنا، وار کیا جاتا ہے صاحب
کیچڑ تھا، پتھر کیا پھینکا، دامن داغ کمایا ہم نے

طارق بٹ

غزل

ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھے ہیں
رات دن ایک کر کے بیٹھے ہیں

موت کا تو فقط بہانہ ہے
زندگی تجھ سے ڈر کے بیٹھے ہیں

کیا خبر کب اٹھا دیے جائیں
ہم جہاں عمر بھر کے بیٹھے ہیں

کیا ہوا ہے یہ جیتے جی ہم کو
کیسے بے موت مر کے بیٹھے ہیں

خط کا مضمون بھانپنے کے لیے
سامنے نامہ بر کے بیٹھے ہیں

غیر بھی ایسے بیٹھتے تھے کبھی
جیسے افراد گھر کے بیٹھے ہیں

ایسی مشکل میں بھی پرندے تو
ساتھ جڑ کر شجر کے بیٹھے ہیں

یہ جو دریا پڑے ہیں رستے میں
میرے سر سے گذر کے بیٹھے ہیں

لوگ دل میں اترنے والے بھی
کیسے دل سے اتر کے بیٹھے ہیں

مسعود احمد

غزل

پھول ہاتھوں میں نہ آئے تو بکھرتا کب ہے
حُسن نظروں میں نہ آئے تو نکھرتا کب ہے

اک تصور سے ہی روشن ہیں در و بام مرے
چاند کا علم نہیں چھت سے گزرتا کب ہے

جانے والے کو اگر روکو تو کب رکتا ہے
اور چلا جائے تو پھر دل سے اُترتا کب ہے

اس کی خوشبوئے قبا رقص کناں ہے ہر دم
بھید کھلتا نہیں وہ شخص گزرتا کب ہے

اُس کی آہٹ پہ یہ رک جاتا ہے چلتے چلتے
ورنہ کم بخت مرا دل یہ ٹھہرتا کب ہے

موت اور زیست میں کچھ فرق نہیں اے اجملؔ
تو نہیں جانتا کب جیتا ہے ، مَرتا کب ہے

اجمل اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تتلی کے لیے کیا مرے اندر ہمک اُٹھا
اِس عمر میں بچوں کی طرح دوڑ پڑا میں

غزل

ظلم صیاد کے ہم نے بھی ہیں دیکھے پہلے
ایسے کب اٹھتے تھے پھولوں کے جنازے پہلے

پھر رہِ عشق کا بنتا ہے مسافر تو بنے
پیار کرنے کے سمجھ لے وہ تقاضے پہلے

اور پھر آ کے بگولوں نے کیا رقصِ ستم
اُڑ گئے تھے مرے گلشن سے پرندے پہلے

زیست کی راہ میں دیکھا ہے چلن ایسا بھی
جو چلے بعد میں ، منزل پہ وہ پہنچے پہلے

آج بچوں ہی کے اغوا میں ملوث نکلا
بیچا کرتا تھا جو گلیوں میں غبارے پہلے

اب رضاؔ لذتِ آزار کا خوگر دل ہے
درد کی ٹیس اُٹھا کرتی تھی پہلے پہلے

رضا اللہ حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے بتِ زیبا! تری ضربِ تغافل کی قسم
کرچی کرچی تیرے، قدموں میں بکھر جائیں گے ہم

غزل

میری آنکھوں میں کہاں کوئی مکاں رہتا ہے
وہی رہنے کی جگہ ہے تو جہاں رہتا ہے

دیکھنے سے جسے بینائی چمک اٹھتی ہے
ہر جگہ ڈھونڈ لیا، جانے کہاں رہتا ہے

جس قدر تم مری آنکھوں کو بھلے لگتے ہو
اس قدر کوئی حسیں اور کہاں رہتا ہے

وہ مہکتی ہوئی خوشبو کی طرح ہے دل میں
جس قدر اس کو چھپاؤں وہ عیاں رہتا ہے

اپنے حالات کسی طور بدلتے ہی نہیں
درد دن رات رگ و پے میں رواں رہتا ہے

ڈھونڈتے ڈھونڈتے رستے بھی بھٹکتے ہیں جہاں
ہاں اسی پیاس کے صحرا میں کنواں رہتا ہے

اس کو جب سے نظر انداز کیا ہے میں نے
رات دن سامنے آنکھوں کے دھواں رہتا ہے

محمد اشرف کمال

غزل

تازہ کرنے میں زمانہ نہیں ہونے دوں گا
اب کے میں زخم پرانا نہیں ہونے دوں گا

خانہ ویرانی دریچے نئے وا کرتی ہے
جانے والے کو روانہ نہیں ہونے دوں گا

ختم ہاتھوں سے کسی اور کے یہ آپ کا راج
ہو تو سکتا ہے، کہانا، نہیں ہونے دوں گا

آڑے آنے نہیں دینے ہیں ملاقات میں جسم
کارگر کوئی بہانہ نہیں ہونے دوں گا

مصرع تر کے لیے اشک بہاؤں گا نہیں
کبھی خالی یہ خزانہ نہیں ہونے دوں گا

دوسرا کوئی ہدف آپ چنیں یا نہ چنیں
دل کو ہر بار نشانہ نہیں ہونے دوں گا

زندہ رہنے کے لیے آپ ضروری نہ رہیں
خود کو اتنا بھی توانا نہیں ہونے دوں گا

صورتِ شعر، کھلاؤں گا سمن اور گلاب
اپنے خوابوں کو فسانہ نہیں ہونے دوں گا

آپ سرشار رہے ہیں مری دیوانگی سے
دلِ ناداں کو میں دانا نہیں ہونے دوں گا

اکرم جاذب

غزل

دریا غمِ فراق کا اُترا ہی نہیں ہے
کاجل بھی تیری آنکھ کا بھیگا ہی نہیں ہے

ہم تو جمالِ یار کے نقشے میں کھوئے ہیں
پیکر جمالِ یار کا سمٹا ہی نہیں ہے

تم کیا گئے کہ بانجھ تخیل بھی ہو گیا
مدت ہوئی ہے میں نے بھی لکھا ہی نہیں ہے

وہ بے مثال حسن تھا گھر دل میں کر چکا
دِل پھر کسی کے نام پہ دھڑکا ہی نہیں ہے

ہم بھی تو اُس کے شہر سے یونہی گزر گئے
کیسا سخی فقیر ہے! سنتا ہی نہیں ہے

پھر زندگی کی شام بھی ڈھلتی ہے ہر گھڑی
سود و زیاں کا سلسلہ رُکتا ہی نہیں ہے

ہم نے تو اُس کے واسطے لاکھوں جتن کیے
پتھر کا آدمی تھا وہ پگھلا ہی نہیں ہے

طلعت شبیر

غزل

کوئی ملنے کی اب سبیل کرو
ہجر موسم نہ اب طویل کرو

عشق لگتا ہے جیت جائے گا
چاہے جس کو بھی تم وکیل کرو

چاند بیتاب ہے اترنے کو
اپنی آنکھیں تو پہلے جھیل کرو

سب میں آسانیاں کرو تقسیم
اپنے دل کو نہ یوں بخیل کرو

میں نہ مانوں کو کیسے مانوں میں
پیش کوئی تو تم دلیل کرو

تم کو منزل تلاش کر لے گی
ہر قدم اپنا سنگِ میل کرو

میں ہوں حاضر برائے مشقِ ستم
مجھ کو جی بھر کے نیل و نیل کرو

منتظر کب سے ہے ترا حلاج
اپنا مرشد اسے جلیل کرو

احمد جلیل

غزل

عین ممکن ہے کچھ نیا دیکھے
آئینے کو جو آئینہ دیکھے

ہجر میں ضبط دیکھنے والا
وصل میں دل کا حوصلہ دیکھے

جو دکھایا گیا وہ دیکھا گیا
دیکھنے والا اور کیا دیکھے

میں نے دیکھا تھا ایک پل اُس کو
اب کوئی میرا دیکھنا دیکھے

زندگی کو گزارنے والا
خواب دیکھے کہ راستہ دیکھے

تھک گیا ہوں میں دیکھ کر خود کو
اب مجھے کوئی دوسرا دیکھے

جس کو ہونا سمجھنا ہو عاصمؔ
میرے ہونے کا سلسلہ دیکھے

عاصم اعجاز

غزلیں

خود سے ہارے ہوئے قدموں کی دھمک پڑتی ہے
مت بجا بانسری سینے میں کسک پڑتی ہے

جاننا چاہتے ہیں لوگ مرے حسن کا راز
ماہ و خورشید کی چہرے پہ چمک پڑتی ہے

میں نظر لگنے کے بارے میں بھی سنجیدہ ہوں
ورنہ کب ایسی رکاوٹ کہ اٹک پڑتی ہے

میں نے مدت سے نہیں پہنا کوئی بھی زیور
تو اگر تھامے کلائی میں کھنک پڑتی ہے

رخشندہ نوید

عشق و عاشقی جیسا شوق کم رکھا جائے
کوئی ہلکا پھلکا سا دل میں غم رکھا جائے

آنکھ بھی تو چاہے گی کچھ نہ کچھ بیاں کرنا
دل میں آگہی کو بھی، دم بدم رکھا جائے

تنگ جن پہ ہے دنیا اُن کو کیا دکھائی دے
سامنے بھلے ان کے جامِ جم رکھا جائے

دیکھ بھال اچھی کی، ماں نے چاروں بیٹوں کی
ایک چھت تلے سب کو تا بہم رکھا جائے

جانتی ہے مری پائل تری باہوں کا مزاج
رقص میں آنے سے پہلے ہی چھنک پڑتی ہے

زور سے دل کا دھڑک اُٹھنا خلافِ معمول
روبرو اُس کے زباں میں بھی اٹک پڑتی ہے

جب بھی مقصود مجھے جیت ہوئی رخشندہ جی،
کم اُسی وقت محبت کی کمک پڑتی ہے

ہم نے کب کسی سے کچھ مانگنے کی کوشش کی
کچھ مگر زمانے میں، خواب نم رکھا جائے

گیت نامکمل تھا سُر سُروں کی بندش تک
اس قدر تو سانسوں میں زیر و بم رکھا جائے

غزل

خیال و خواب سے ہم گفتگو نہیں کرتے
کبھی سراب کی ہم جستجو نہیں کرتے

تمہارے ہجر کے صحرا میں گھٹ کے مر جاتے
ہم اپنی آنکھ کو گر آب جو نہیں کرتے

بطورِ خاص ہے نسبت جنہیں چراغوں سے
کبھی ہوا کو وہ اپنا عدو نہیں کرتے

مجھے یقین ہے وہ دل میں کھوٹ رکھتے ہیں
جو دل کی بات مرے رو برو نہیں کرتے

ہمیں متاعِ ہنر کی طلب ہے مولا سے
زرِ جہاں کی مگر آرزو نہیں کرتے

تمہارا نام بھی لیتے ہیں احترام کے ساتھ
تمہارا ذکر بھی ہم بے وضو نہیں کرتے

جو عاشقی میں حقیقت پسند ہیں دانش
وہ اپنا چاک گریباں رفو نہیں کرتے

اعجاز دانش

غزل

موسمِ گُل عجب گُل کھلانے لگا
میرا محبوب چہرہ چُھپانے لگا

قربتیں خواب ہوکر سبھی رہ گئیں
مِلنا جُلنا تو بالکل ٹھکانے لگا

ہم پہاڑوں سے خائف نہیں ہو سکے
ایک ننھا سا ذرّہ ڈرانے لگا

غیر محتاط سارے رویّے گئے
ہر کوئی احتیاطیں بتانے لگا

قیدِ تنہائی جس کو دوا میں مِلی
وہ جبیں کو زمیں سے لگانے لگا

ہر معالج محافظ مسیحا بنا
کھیل کر جاں پہ جانیں بچانے لگا

شفیق امتحاں کے دنوں میں ہیں اب
ہم کو پروردگار آزمانے لگا

محمد شفیق انصاری

غزلیں

بادہ کشی سے کیسے ہوں درد و الم ، غلط
گردش میں دیکھتے ہیں جو ہم جامِ جم ، غلط

تیری وفا کا دل کو ہو کیا اعتبار، دوست!
پیمان سارے خام ہیں ، قول و قسم ، غلط

گرچہ ، مقام عشق ہے ارفع بہت ، مگر
ہر بوالہوس نے سمجھا اسے ایک دم ، غلط

ان سے رکھی ہے آج بھی ہم نے امیدِ عدل
جن کی نظر میں ٹھہرے ہیں ہر بار ہم ، غلط

ممکن نہیں اگرچہ ، مداوائے دردِ عشق
لیکن ،دھمال کھیل کے ، کرتے ہیں غم ، غلط

کارِ غلط کو کس لیے کارِ حَسَن لکھوں
لفظِ غلط کو لکھتا ہے نوکِ قلم ، غلط

شوکت بہ وقتِ مرگ ہوا منکشف یہ راز
سطوت سبھی فضول ہے ، جاہ و حشم ، غلط

شوکت محمود شوکت

قید،خوش بوئے چمن ہو، یہ نہیں ہے ممکن
شوق، پابندِ رسن ہو ، یہ نہیں ہے ممکن

ساری دنیا ، جسے گردانتی ہے میرا رقیب
اس کو مجھ سے نہ جلن ہو، یہ نہیں ہے ممکن

خوگرِ دشت نوردی ہیں مرے پاؤں ابھی
راہِ الفت میں تھکن ہو، یہ نہیں ہے ممکن

تیرے دشنام مجھے یارِ حسیں! از شت لگیں
دل کا یوں ٹیڑھا چلن ہو، یہ نہیں ہے ممکن

کوئی کرتا ہے اگر بات کسیلی تو کرے
اپنے ماتھے پہ شکن ہو، یہ نہیں ہے ممکن

عمر ڈھلنے ہی سے جانا ہے کہ قائم دائم
حسنِ فانی کی پھبن ہو، یہ نہیں ہے ممکن

پیرو غالب و اقبال کا شوکت محمود
پست معیارِ سخن ہو ، یہ نہیں ہے ممکن

غزل

اس لیے بھی تو کسی سے نہیں لڑ کر آئے
پیڑ آنگن میں اگایا تھا سو پتھر آئے

تو نے تعبیر بتائی ہے بھیانک جن کی
ایسے کچھ خواب مجھے یار تواتر آئے

تیری آنکھوں میں کہیں ڈوبتا سورج دیکھوں
ایسی اے کاش کوئی شام میسر آئے

میری ہر رات جو آنکھوں میں گزر جاتی ہے
میرے حصے میں فقط کانٹوں کے بستر آئے

وہ مرا شعر مکمل نہیں ہونے دیتا
ایک مصرع جو کبھی بھولے سے بہتر آئے

جاں بہ لب ہوں میں کوئی جا کے بتائے اسکو
آخری دید کو اک بار ستمگر آئے

ٹوٹے خوابوں کا ہے جذیہ یوں اتارا ارشد
اشک پلکوں کی منڈیروں پہ ہیں اکثر آئے

ارشد محمود ارشد

غزل

کاروں کی دوڑ ہے، کہیں گھوڑوں کی دوڑ ہے
دراصل اب جہان میں پیسوں کی دوڑ ہے

اک بھائی کو بھی بھائی سے آگے نکلنا ہے
غیروں کی اب نہیں یہاں اپنوں کی دوڑ ہے

اب دیکھتے ہیں کس کو نظر آتا ہے دُور تک
اندھوں کا دیس ہے یہاں آنکھوں کی دوڑ ہے

نگڑے ہوئے ہیں پی کے یہ مزدور کا لہو
سرمایہ داروں کی نہیں، سانپوں کی دوڑ ہے

کردار جن کے پست ہیں، جیتیں گے پھر وہی
بے کار لوگ ہیں سبھی ، باتوں کی دوڑ ہے

اب ہر کسی کو خواب کی تعبیر چاہیے
ہر شخص بے قرار ہے، سوچوں کی دوڑ ہے

بچپن گزر گیا ہے ، جوانی گزر گئی
یہ زندگی ہے یا کوئی سانسوں کی دوڑ ہے؟

جب دوڑنا ہی شرط ہے، دوڑیں گے ہم ضرور
یہ تو بتاؤ کتنے مہینوں کی دوڑ ہے؟

اب ہار جیت کا تو کرے وقت فیصلہ
یہ دوڑ اپنے اپنے نصیبوں کی دوڑ ہے

مقبولیت کسے ملے ، کیفی کسے ہے علم؟
اب شاعری کی دنیا میں شعروں کی دوڑ ہے

محمود کیفی

غزل

بہاروں نے، نمو کی اب عجب صورت نکالی ہے
متاعِ رنگ و بو سے گلستاں سارا ہی خالی ہے

وہ غنچے توڑ دے یا دے اُنہیں کھلنے تلک مہلت
وہی تو لاشریک اِس باغِ آب و گِل کا مالی ہے

کنارے سے کوئی اترا نہیں طوفاں کی لہروں میں
وگرنہ نقش سطحِ آب تک اپنی اچھالی ہے

تری تخلیق کی کیا کیا کروں مدحت سرائی میں
کہ مصروفِ ثنا جب خوشہ خوشہ ڈالی ڈالی ہے

نہیں کوئی برابر آ کے ٹھہرا تلخ لمحوں میں
اگرچہ ہر طرف اُس دم نظر تو ہم نے ڈالی ہے

حقیقت میں نہیں دل کو سکوں حاصل کسی صورت
مگر موجِ تبسم پھر بھی چہرے پر سجا لی ہے

نظر آئیں نہ راہِ عشق کی دُشواریاں فرحان
کسی نے اِس طرح گردِ سفر آنکھوں میں ڈالی ہے

سرور فرحان

غزل

مرے حریفوں نہ بدخواہ شہریوں نے مجھے
ڈسا مری ہی پٹاری کے زہریوں نے مجھے

یہ میں کہ عدل ہوں پوچھو نہ مجھ پہ کیا گزری
بہت خراب کیا ہے کچہریوں نے مجھے

عجب سوال اٹھاتے ہیں کیا کہوں یا رب
کیا ہوا ہے پریشان دہریوں نے مجھے

کنواریاں ہیں گھروں میں خموش ، افسردہ
بہت دکھی کیا ان گونگی بہریوں نے مجھے

اِدھر اُدھر کی اچھل کود کے سوا روشن
دکھایا کوئی نہ کرتب گلہریوں نے مجھے

اعجاز روشن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زندگی کے ہاتھ میں تو ہاتھ دے دیں گے، مگر
وحشتوں کے پاؤں میں کیا خاک پہنائیں گے ہم

غزل

سب جانتے ہوئے بھی میں انجان کب ہوا
اچھا بھلا مقیم تھا، مہمان کب ہوا

وہ تو زمانے آ گئے خود چل کے اُلٹے پاؤں
ورنہ کسے خبر تھی کہ نقصان کب ہوا

دُنیا کو چھوڑیے کہ یہ دریافت کب ہوئی
انسان کا بتائیے ، انسان کب ہوا

گھڑی بھی سر کی سر پہ رہی، گھر بھی آ گیا
اب کیا کہوں میں بے سروسامان کب ہوا

جسموں کے جسم لگ گئے اور کچھ نہ بن پڑا
جو ہجر تھا ، حجاب تھا ، ہیجان کب ہوا

مٹی کو سب پتہ ہے، بتاتی نہیں مگر
یہ شہر میرے حق میں بیابان کب ہوا

سرگوشیاں ہوئیں کہ یہاں ہو گیا ہے کچھ
میں جا چکا جہان سے، اعلان کب ہوا

ہونا پڑا ہے بارہا ، یعنی ہزار ہا
ہونا اِس ایک بار کا آسان کب ہوا

اب ہے کہیں وہ شیشہ جبیں، جس کو یاد تھا
حیران کب ہوا میں، پریشان کب ہوا

میں تو کسی طرف کا بھی حامی نہ تھا کبھی
تیری طرف نہ جانے مرا دھیان کب ہوا

شاداب کب ہُوا میں، چلیں پوچھتا نہیں
اِتنا تو جان سکتا ہوں سنسان کب ہو

میں دوسرا تھا جس نے کہ حیرت شعار کی
پہلا گر آئنہ تھا تو حیران کب ہوا

شاہین عباس

غزل

تنہائی آباد کیے رکھتا ہوں میں
اس کو مسلسل یاد کیے رکھتا ہوں میں

روز دکھاتا ہوں میں تماشا دنیا کو
تازہ ہنر ایجاد کیے رکھتا ہوں میں

دوست کی خاطر ہو جاتا ہوں خود برباد
دشمن کو برباد کیے رکھتا ہوں میں

جو بھی کہنا ہو میں کہہ دیتا ہوں صاف
سب کو ہی ناشاد کیے رکھتا ہوں میں

کرتا ہوں تعمیر ہزاروں خواب محل
اشکوں کو بنیاد کیے رکھتا ہوں میں

اور کسی سے کچھ نہیں کہتا میں شوکت
مولا سے فریاد کیے رکھتا ہوں میں

افتخار شوکت

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بس اک آواز پر تو لوٹ آتا
کسی کے پاس یہ جادو نہیں تھا

غزل

محبت ،روشنی، سورج، ستارہ قید میں ہے
یہ عالم اِس میں جو کچھ ہے وہ سارا قید میں ہے

اسے ہی چار سو دیکھیں تو نظریں ہیں مقید
مگر ہم یہ سمجھتے ہیں نظارہ قید میں ہے

مگر کیسے پرندہ جا نکلتا ہے فلک میں
کہ جب یہ کوزہ گر، مٹی، یہ گارا قید میں ہے

اسیرانِ خلا ٹھہرے جہانِ کن میں سب ہی
مکیں آزاد بھی ہوں تو ستارہ قید میں ہے

حبیب! ابلاغ تیرا ایسے ممکن ہی نہیں ہے
غزل جب ہو گیا مضمون سارا، قید میں ہے

بشیر احمد حبیب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بند دروازہ تھا خالد ، یا عبادت گاہ تھی
اس کے دَر پر سارے بے کس، سارے بے گھر سو گئے

غزل

وفورِ دل سے بپا کر رہا ہُوں شامِ غزل
کہ اہلِ ذوق ہی کرتے ہیں اہتمامِ غزل

ہے جس میں دردِ زمانہ بھی حُسن و عشق بھی ہے
اثر کرے گا ہر اِک دل پہ وہ کلامِ غزل

سُرور و کیف بھرا جس کو لُطف مِل نہ سکا
اُسی نے نوش کیا میرے ہاتھوں جامِ غزل

جنھیں شعور مِلا شعر کے تقدّس کا
بنے ہوئے ہیں وہی لوگ اب غُلامِ غزل

اگر نہیں ہے تمھیں فہم شعر گوئی کا
تو شاعری نہ خدارا کرو بنامِ غزل

جنھیں سُخن سے ذرا سی بھی آشنائی ہو
ضرور اُن پہ تو واجب ہے احترامِ غزل

جو آفتابِ غزل کا اُسے خطاب مِلا
تو آفتاب ہی کہلائے گا امامِ غزل

آفتاب خان

غزل

کوچۂ یار میں آنے جانے لگے
پھر مقدر کو ہم آزمانے لگے

آپ جب سے نگاہیں چرانے لگے
اور بھی کچھ نگاہوں کو بھانے لگے

ابتدائے محبت ہوئی اِس طرح
دیکھتے ہی مجھے مسکرانے لگے

دفعتاً جان قربان ہونے لگی
دفعتاً دل میں آ کر سمانے لگے

تشنگی کا جب آنکھوں نے شکوہ کیا
آنکھوں آنکھوں میں ہی وہ پلانے لگے

اُن کی مخمور آنکھوں میں گُم ہو گئے
ہم بھی کونین کے بھید پانے لگے

ایک پل میں کہیں کھو دیا ہے اُسے
جس کو پانے میں ہم کو زمانے لگے

جب کوئی اور صورت دکھائی نہ دی
ہجر میں وصل کے گیت گانے لگے

کیا تمہیں بھی جہاں کی ہوا لگ گئی
تم بھی فیضان نخرے دکھانے لگے

فیض رسول فیضان

غزل

اشک ضدی تھے مگر ہم نے برسنے نہ دیا
ہم نے دریا کو کناروں سے نکلنے نہ دیا

تُند کتنی تھی ہوا اور چراغوں کا سفر
ہم نے شعلوں کو سرِ بام مچلنے نہ دیا

ایک ہی دل تھا کہ اس پر تھے ہزاروں چرکے
سوکھے پتوں کی طرح درد کو اُڑنے نہ دیا

دامنِ دل پہ جو اِک داغِ وفا آج بھی ہے
اشک کیا چیز اُسے خون سے دُھلنے نہ دیا

تو ٹھکانے سے لگا دل کو ہنر کاری سے
ہم نے ہر حال میں بس عشق کو مرنے نہ دیا

باندھ کے رکھ لیے پَر اپنے پرندوں کی طرح
سرِ افلاک مرے خواب کو بڑھنے نہ دیا

زندگی اب بھی کئی دائروں میں گھومتی ہے
چاک پر رکھا مگر شکل میں ڈھلنے نہ دیا

آسناتھ کنول

غزل

ہم اس نگاہ میں رہے جو خود بہت اداس تھی
جوان کہی سی بات تھی وہ بات ہم کو راس تھی

وہ راستوں کی بھیڑ سے بچ بچا کے کھو گیا
اک ہجوم وحشتاں میں لومڑی کی باس تھی

پگھلے تھے سب گلیشیر، مضمحل طیور تھے
کٹ چکے تھے اشک بھی پتلیوں پہ گھاس تھی

وہ کس طرح کے تیر تھے جو خود کمان کھا گئے
تنگ بانٹتی تھی جو وہ کون سی کپاس تھی

فرق نہیں جو کر سکا شعور میں، فتور میں
جسے تلاش فقر تھی، خبر اسی کے پاس تھی

جنوں قرار پا گیا تبھی تو گہن لگ گیا
حواس میں تھی جب تلک میں خود بھی بے حواس تھی

سعدیہ بشیر

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

ہم نے کاغذ کو بھی آئینہ کر دیا
لیکن اپنی سیہ بختیاں رہ گئیں

غزلیں

بوجھ بڑھنے لگا تھا ناؤ پر
پاؤں رکھنے پڑے بہاؤ پر

موت رکھی ہے رہگذاروں میں
زندگی لگ چکی ہے داؤ پر

جانے کب کس کا وار کاری ہو
آج کل ہر کوئی ہے داؤ پر

اتنی اونچی اڑان ٹھیک نہیں
اے پرندو نہ یوں گنواؤ پر

اب یہ جھگڑا نہیں ہے کرسی کا
آبروئے وطن ہے داؤ پر

کس نے دوزخ کی پہریداری کی
شہر کو رکھ دیا الاؤ پر

خاک ہو کر بکھرنے لگتا ہوں
اس کے بدلے ہوئے سبھاؤ پر

شاعری کو الگ مزاج ملا
اس غزل میں نئے رچاؤ پر

رنگ تصویر کے بدل جائیں
پنچھیوں کے نئے بناؤ پر

ایسا لگتا ہے چل رہا ہوں نوید
ایک رسی کے میں تناؤ پر

محمد نوید مرزا

شکستگی نے یہ پوچھا خراب حالوں سے
یہ ٹوٹ پھوٹ بدن میں ہے کتنے سالوں سے

اذیتوں میں گذاری ہے زندگی ساری
گلہ یہ خود سے کریں یا جہان والوں سے

کبھی کبھی تو اندھیرے بھی راس آتے ہیں
کبھی کبھی تو میں ڈرتا ہوں ان اجالوں سے

مرا شعور مری شاعری میں زندہ ہے
میں یاد آؤں گا دنیا کو ان حوالوں سے

منافقت کا لبادہ اتار پھینکا ہے
میں اس کو اوڑھ کے بیٹھا ہوا تھا سالوں سے

غریبِ شہر ترا پیٹ بھر نہیں سکتا
امیرِ شہر سے مانگے ہوئے نوالوں سے

خیال و خواب میں جنگل سے جب گذرتا ہوں
مکالمہ مرا ہوتا ہے کچھ غزالوں سے

غزل

حسینیت کا ہر اک لب پہ تذکرہ بھی ہے
کسی میں حق کی حمایت کا حوصلہ بھی ہے

ترے فرس پہ تصدق ترے علَم پہ نثار!
لگام کھینچ کہ پیچھے شکستہ پا بھی ہے

ہجومِ سنگ زناں میں وہ گل بدست آیا
ہجومِ سنگ دلاں میں وہ دل ربا بھی ہے

وہ جس کا نام مورخ قلم پہ لا نہ سکے
اسی کا نام زمانوں میں گونجتا بھی ہے

قدم قدم پہ بلاؤں سے پُر ہے یہ جنگل
قدم قدم پہ کسی کی مگر دعا بھی ہے

وہی جو ظلم کی رسی دراز کرتا ہے
وہی پھر عدل کی میزاں پہ تولتا بھی ہے

نہ کوئی مدِّ مقابل نہ صف نہ طبل و علَم
اور ایسی جنگ میں جاذب وہ جیتتا بھی ہے

شکیل جاذب

غزلیں

تجھ بے رخی سے کب کوئی حیرت ہوئی مجھے
آئی جو تیری یاد تو وحشت ہوئی مجھے

اب جا کے تیرے ہجر کی عادت پڑی کہیں
اب جا کے خیر اتنی سہولت ہوئی مجھے

تیرے خیال سے ہی ضرورت مٹائی ہے
جب تجھ علاوہ کوئی ضرورت ہوئی مجھے

زینت کی بات خیر سے زینت کی بات ہے
وحشت تمھارے کوچے کی زینت ہوئی مجھے

ورنہ میں آشنا بھی محبت سے کب تھا دوست
تجھ پر نظر پڑی تو محبت ہوئی مجھے

ہوتے ہیں سیر چشم تری دید سے قمر
دیکھوں جو اور کسی کو مشقت ہوئی مجھے

قمر نیاز

کہ بے گھری میں ٹھکانہ دکھا کے مار دیا
خلا نورد کو سبزہ دکھا کے مار دیا
مواحدوں سے لڑائی نہیں محبت تھی
روایتوں کا وسیلہ دکھا کے مار دیا
کسی نے جھیل میں رکھا قدم تو مکتی ملی
شعاعِ حسن نے دریا دکھا کے مار دیا
جمالِ یار کے رستے پہ چل رہا تھا میں
جمالِ یار نے رستہ دکھا کے مار دیا
کسی کی کشتی ڈبو دی ڈبونے والے نے
کسی کو تو نے سفینہ دکھا کے مار دیا

تمھیں تو وصل سے بخشی ہے زندگی اس نے
کسی کو ہجر کا نقشہ دکھا کے مار دیا
بھنور سے بچنے کی کوشش میں کھو گیا میں اِدھر
اُدھر کسی نے کنارہ دکھا کے مار دیا
قمر نیاز دعا سے کیا علاج کبھی
کبھی مریض کو حیلہ دکھا کے مار دیا

غزل

مجھ کو پانچ مرلے میں ایک گھر بنانا ہے
اور ایک دنیا کو توڑ کر بنانا ہے

میں بھی کیسا پاگل ہوں رخصتی کی ساعت میں
اجنبی زمینوں پر اک نگر بنانا ہے

یہ جو ہیں نا دیواریں میں نے خود اٹھائی ہیں
اب کہیں کہیں ان میں کوئی در بنانا ہے

زیرِ ناف سے لے کر پیٹ تک بنا ہوں میں
کب مرے مصور نے میرا سر بنانا ہے؟

رنگ رنگ کی مٹی کر رہا ہوں میں یک جا
رنگ رنگ سا خود میں اک بشر بنانا ہے

قافلے بچانے ہیں پھر ہوا کی سازش سے
ریت پر مجھے رستہ عمر بھر بنانا ہے

ہے خیالِ دامن بھی، ہاتھ بھی نہ ہوں زخمی
اس پہ خارزاروں کو رہ گزر بنانا ہے

صرف تیرنے سے یہ کام ہو نہیں سکتا
پانیوں پہ نقشِ پا ڈوب کر بنانا ہے

دن نکلنے والا ہے، رات ڈھلنے والی ہے
سو مجھے فسانے کو مختصر بنانا ہے

میں بنا رہا ہوں دل وہ بھی کچھ شکستہ سا
چشمِ نیل گوں تجھ کو چشمِ تر بنانا ہے

کینوس پہ سینچا ہے اک شجر سہانا سا
اور اب پرندوں کا اس میں گھر بنانا ہے

دیکھیے بنایا ہے کیسا خوش نما طائر
عکس بس مکمل ہے، صرف پر بنانا ہے

چھاؤں کے لیے مجھ کو دھوپ سے ذرا پہلے
بانجھ شاخ زاروں میں برگ و بر بنانا ہے

سوچتا ہوں اب کیسے پاس ان کو بلواؤں
پھر مجھے پرندوں کو نامہ بر بنانا ہے

کام جان لیوا سا آ گیا ہے حصّے میں
خواب ناک آنکھوں کو خواب گر بنانا ہے

علمدار حسین

غزل

وہ زیست کیا ہے کہ جس میں کوئی کمال نہ ہو
چمکتا ماضی نہ ہو اور درخشاں حال نہ ہو

وصالِ یار تو ہوتا ہے ہجر سے مشروط
خوشی خوشی نہیں رہتی اگر ملال نہ ہو

کچھ اس طرح سے ملاتا ہے ہاتھ وہ مجھ سے
میں سوچتا ہوں کہ اس میں بھی کوئی چال نہ ہو

غموں کے دور میں غم خوار ڈھونڈتے ہی رہے
مسرتوں میں بھی جس کو ترا خیال نہ ہو

زمانے بھر کی نگاہوں میں معتبر ٹھہرے
مرے کلام کی جگ میں کوئی مثال نہ ہو

وفا کی راہوں میں منزل اسی کو ملتی ہے
رہے سفر میں ہمیشہ مگر نڈھال نہ ہو

یہ التجا ہے خدا سے کہ حشر میں اشفاق
مری خطاؤں پہ مجھ سے کوئی سوال نہ ہو

محمد اشفاق بیگ

غزل

بس ایک بار کہا تھا کہ آزما مرا دل
وہ توڑ توڑ کے پھر جوڑتا رہا مرا دل

عجیب بات ہے کہتے ہو کچھ نہیں معلوم
تمہارے پاس نہیں تو کہاں گیا مرا دل

مرا قبیلہ سخی ہے سخی بھی ہے کتنا
وہ کچھ تو مانگتا وہ کاش دیکھتا مرا دل

اگر ملا تو فقط یہ اسے بتانا ہے
تمہارے بعد کہیں بھی نہیں لگا مرا دل

صغیر اس لیے کہنا پڑا کہ اب خاموش
اگر یہ میں نہیں کہتا تو بولتا مرا دل

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نسبتِ قیس بنی آخری تنکا خالد
بارِ محمل نہ اُٹھا ناقۂ دانائی سے

غزل

بچپن دکھائی دیتا ہے عہدِ شباب میں
ہر رات دیکھتا ہوں کھلونے میں خواب میں

دھرتی کے سب حسیں ہیں اِسی پر فریفتہ
جانے خدا نے رکھا ہے کیا کیا گلاب میں

یہ بھی تو بے بسی ہے کسی لکھنے والے کی
غم کھلکھلا رہے ہیں غزل کی کتاب میں

سارے حسین لمحے فقط آپ کے لیے
میں نے بچا کے رکھ دیے فرصت کے باب میں

اچھا تو پھر سنو جو ہوا ہے تمہارے بعد
آنسو ملا کے میں نے پیے ہیں شراب میں

اسد رضا سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم اپنے دل پہ کچھ نازاں تھے خالد
سو اک دن ہم کو ہونا تھا خجل بھی

غزل

سخن سرائے میں لشکر نہیں مِلا کرتے
ہم ایسے لوگ مکرّر نہیں مِلا کرتے

یہ شعر گوئی ہے کارِ پیمبری کی طرح
خریدنے سے یہ جوہر نہیں مِلا کرتے

سخن کے منصبِ تعظیم پر ہیں فائز آپ
ہر آنے والے سے اٹھ کر نہیں مِلا کرتے

وہ جن سے دل مِلا کرتے ہیں آنکھ ملتے ہی
تو کیوں انھی سے مقدّر نہیں مِلا کرتے

فقط وہ ایک ہے ایسا چنا گیا ہے جسے
ہر ایک شخص کو بستر نہیں مِلا کرتے

یہاں تو ہوتے ہیں لیکن یہاں نہیں ہوتے
ہم اپنے آپ میں اکثر نہیں مِلا کرتے

بھٹکنے والوں کو منزل نہیں مِلا کرتی
بکھرنے والوں کو رہبر نہیں مِلا کرتے

طلب کے ساتھ تگ و دو ہے لازمی نازش
جنوں بغیر تو دلبر نہیں مِلا کرتے

شبیر نازش

غزل

میرا دیوان مختصر نہیں ہے
نالۂ ہجر بے اثر نہیں ہے

شاذ و نادر دکھائی دیتا ہے
مجھ میں موجود سربسر نہیں ہے

وقت نے کر دیا ہے سب تبدیل
گھر میں پنچھی نہیں، شجر نہیں ہے

عشق میں سب لُٹا کے سوچتا ہوں
منفعت ہے یہاں ضرر نہیں ہے

کیسے عالم میں ہوں کہاں ہوں میں
اب کسی کو مری خبر نہیں ہے

خود شناسی کے بعد راز کھلا
یہ سفر اتنا پُر خطر نہیں ہے

کس کو دستارِ عاشقی دیجے
کوئی شایانِ شان سر نہیں ہے

دل کے حجرے میں آیئے صاحب
اس میں اک لمحہ شور و شر نہیں ہے

مجھ کو تنہائی بھی نہ راس آئی
جاہ و منصب پہ بھی نظر نہیں ہے

موت سر پہ کھڑی ہے مستحسن
اور آنکھوں میں کوئی ڈر نہیں ہے

مستحسن جامی

غزل

بن کے وہ شخص یہاں رحم و کرم آیا تھا
مدتوں بعد مری آنکھ میں نم آیا تھا

یہ تو بیکار تھے تاریکی یہاں رہتی تھی
اس کے آنے سے چراغوں میں بھی دم آیا تھا

سب کے سب چاہنے والے ہی بچھڑ جاتے ہیں
کس کے ہاتھوں میں مقدر کا قلم آیا تھا

شدتِ درد سے انسان بڑا ہوتا ہے
شکر کرتی ہوں مرے سینے میں غم آیا تھا

ہجر کی دھوپ نے دونوں کو جدا کر ڈالا
ایک پنچھی مری دیوار پہ کم آیا تھا

منزلیں بنتی گئیں جلتے چراغوں کی مثال
جب مری راہ میں وہ نقشِ قدم آیا تھا

وہ اتر آیا تخیل کے کٹوروں میں سمن
اور پھر ہم کو بڑے چین کا دم آیا تھا

رخسانہ سمن

غزل

ہم اپنے ہی چہرے کی ضیاء ڈھونڈ رہے ہیں
معصوم سی خواہش کا صِلہ ڈھونڈ رہے ہیں

محبوس خیالات ہیں ، مبہم سی ہیں سوچیں
اِس حبس میں ہم تازہ ہوا ڈھونڈ رہے ہیں

اے خستہ چمن تیرے نشیمن سے نِکل کر
احساسِ مروّت کی فضا ڈھونڈ رہے ہیں

انسان پہ انسان کے حق بُھول کے یکسر
کیا لوگ ہیں کعبے میں خُدا ڈھونڈ رہے ہیں

عظمیٰ ترے حرفوں کے مضلے سے لِپٹ کر
بیمار کئی دستِ شفا ڈھونڈ رہے ہیں

عظمیٰ نقوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

فصل تو نے بوئی تھی، لیکن اسے کاٹیں گے ہم
دیکھ تو حدِ نظر تک لہلہاتی دوریاں

غزل

حرف الفت میرے کانوں نے سنا ہے شاید
میں نے خود سوچا ہے یا تو نے کہا ہے شاید

بے حجابی سے ہر اک قلبِ حزیں کو لوٹے
پیکر حسن کو یہ ظلم روا ہے شاید

میں سنبھلتا گیا جس موڑ پر اکثر پھسلے
میرے حق میں کسی مخلص کی دعا ہے شاید

جس کے آگے سے تغافل سے گذر آیا ہوں
میرے پیچھے وہ ابھی دست کشا ہے شاید

یہ نہ ہوگا وہ نہ ہوگا تجھے کیونکر ہے یقیں
عالم غیب میں تو گھوم چکا ہے شاید

روح تک جس کی اذیت کا اثر جا پہنچا
وہی چرکا دلِ مضطر کی دوا ہے شاید

حسن پرویز سیدؔ

غزل

اندھیرے میں وہی تو دِکھ رہے تھے
میرے ہاتھوں میں جو جلتے دیے تھے

بہت بیساکھیاں بکنے لگی تھیں
شجر سارے ہی کاٹے جا رہے تھے

شجر پر بیل چڑھتی جا رہی تھی
بدن سے سانپ لپٹے جا رہے تھے

بغاوت کی خبر پھیلی ہوئی تھی
سبھی کے خواب پرکھے جا رہے تھے

اسے تو صرف روٹی سوجھتی تھی
مگر بچے کھلونے مانگتے تھے

میں اپنی آستیں کو دیکھتا تھا
جہاں سے سانپ نکلے جا رہے تھے

ملن اپنا بہت مشکل ہوا تھا
ہمارے بیچ شجرے آگئے تھے

مری کشتی میں پانی بھر رہا تھا
کنارے دور ہوتے جا رہے تھے

کہاں سب کرب اس دل میں سمائے
کئی چہرے پہ لکھے رہ گئے تھے

عجب جذبوں کی بارش ہو رہی تھی
بدن دونوں کے بھیگے جا رہے تھے

محمد نور آسی

غزل

عقل سے سبز آگہی کا درخت
میں نے دیکھا ہے آگ ہی کا درخت

عشق دیمک کا لاروا ہے جو
چاٹ جاتا ہے زندگی کا درخت

ہوشیاری کی جڑ سے کٹتے ہی
بڑھتا جاتا ہے بے خودی کا درخت

کلمہ روزہ نماز حج و زکوٰۃ
ان سے پھلتا ہے بندگی کا درخت

میرے دُکھ درد کو سمجھتا ہے
میرے آنگن میں ٹاہلی کا درخت

اس کو مت کاٹیے بدن سے مرے
دل ہی تو ہے غمی خوشی کا درخت

میں نے دیکھا ہے وصل کی شب کو
اُس کے عارض پہ روشنی کا درخت

سرفراز عارض

غزل

حوصلہ نہیں دو گے
کیا دعا نہیں دو گے

قافلہ بڑھا لیں ہم
تم صدا نہیں دو گے

مضمحل مسافر کو
آسرا نہیں دو گے

اس گلی میں آنا ہے
راستہ نہیں دو گے

چہرگی مٹا کر بھی
آئنہ نہیں دو گے

منتظر پلٹ آئے
واسطہ نہیں دو گے

کیا جلے دِیا اور آگ
جب ہوا نہیں دو گے

فرح رضوی

غزل

بزمِ جنوں میں ناچتے گاتے چلے گئے
ہم سادگی کے گیت سناتے چلے گئے

راہِ فرار تھی ہی نہیں اس لیے بھی ہم
بگڑی جو تھی وہ بات بناتے چلے گئے

اک ذوق دوستی میں بنانے کے بعد ہم
خوش فہمیوں کے بت بھی گراتے چلے گئے

آتی نہیں یہ موت کی جانب! ہزار طور
ہم زندگی کو روز مناتے چلے گئے

کنجِ مزار چھوڑ کے تیری گلی میں زیست
روحِ رواں کا رقص دکھاتے چلے گئے

خالق آرزو

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم نے تجھے بے وفا کہا تھا
یہ کرب بھی ہم نے ہی سہا تھا

غزل

مرے ٹوٹے ہوئے دل کو دُکھانا مت کہا تھا نا
اِن آنکھوں میں کبھی آنسو سجانا مت کہا تھا نا

میں تنہا تھی میں تنہا ہوں مجھے معلوم ہے لیکن
کبھی یہ بات تم مجھ کو بتانا مت، کہا تھا نا

مرے ہو تو مرے رہنا پرائے تم نہ ہو جانا
تعلق تم زمانے سے نبھانا مت کہا تھا نا

سمجھنے میں مجھے شاید غلط فہمی ہوئی تم کو
مجھے احساس یہ ہرگز دلانا مت کہا تھا نا

نہ ہو تعبیر جب ممکن تو سچائی بتا دینا
کوئی بھی خواب اب مجھ کو دِکھانا مت کہا تھا نا

بہت مشکل سے آیا ہے سنورنا سجنا اور ہنسنا
مرے اندر چراغوں کو بجھانا مت، کہا تھا نا

ہو چاہے جس قدر لمبی شبِ ہجراں نہ گھبرانا
سحر ہوں میں، میں آؤں گی بھلانا مت کہا تھا نا

نادیہ سحر

غزل

برسرِ بزم بنائے نہ تماشہ خود کو
احسنُ الخلق گرائے نہ زیادہ خود کو

شدّتِ وحشتِ آلود اڑائے نہ ہنسی
نفسِ مجروح لگائے نہ طمانچہ خود کو

وحشتیں آج مقدر سی ہوئی جاتی ہیں
آدمی ہی نے دکھایا ہے یہ رستہ خود کو

چیتھڑے خون، کٹے جسم، بکھرتے لاشے
زندگی کیسے دلا پائے دلاسہ خود کو

زندگی خود کسی خیرات سے کم بھی تو نہیں
آہ، انسان بنائے ہوئے کاسہ خود کو

در بہ در پھرتا ہے بہروپ لئے طعنوں کا
جانے کیا کیا ابھی پہنائے لبادہ خود کو

پارسائی کے لبادے میں بھیانک چہرے
کیسے اِترا کے سمجھتے ہیں فرشتہ خود کو

ایک کرچی بھی بلا دیتی ہے پتھر کا جگر
آئنہ ہو کہ نہ سمجھو گے شکستہ خود کو

موجِ مضطر ہی اچھالے گی سمندر اطہر
ڈوب جاتے ہیں جو کہتے ہیں جزیرہ خود کو

علیم اطہر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سورج تھا، مگر، رات گئے ڈوب سکا تھا
اے صبحِ قیامت، میں نکل آؤں نہ گھر سے

غزل

ہمارے شہر کے سُقراط دیکھو
جہالت کی یہاں افراط دیکھو

فسادی ہاتھ میں قانون سازی
علم بردارِ حق ، بُقراط دیکھو

یہ کس برتے پہ اِتراتے پھرے ہیں
خمیدہ طرز کے خطاط دیکھو

تجھے گر شوق ہے کچھ دیکھنے کا
گریباں میں چھپی اغلاط دیکھو

وہ جس نے آستیں میں سانپ پالے
ہُوا ہے کس قدر محتاط دیکھو

بھروسہ زہرِ قاتل ہے جہاں میں
یہی ہے سب کا استنباط دیکھو

عباس علی شاہ ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سر و سامانِ سفر مانگ لیا
قاصدِ شام نے سر مانگ لیا

غزل

لہلہاتے کھیت خوشوں سے بھرے
بارشوں سے لوگ خدشوں سے بھرے

جھنگ کے بیلے ہیں رانجھوں سے تہی
اور دریا ان کی لاشوں سے بھرے

سیر چشمی دید بن ممکن نہیں
پیٹ کب روٹی کی باتوں سے بھرے

روح اپنی دفتروں میں قید ہے
سانس اپنے سرخ گرہوں سے بھرے

علم و حکمت سے ہیں خالی حافظے
شیلف ہیں گرچہ کتابوں سے بھرے

منہدم آثار بھی آباد ہیں
خالی پنجر بھی ہیں سانسوں سے بھرے

اصغر علی بلوچ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اس بلندی پہ ہم نے پڑاؤ کیا
جس کے آگے فقط پستیاں رہ گئیں

غزلیں

بات سنتے ہو خاص لوگوں کی
کبھی سن لو اداس لوگوں کی

پاس رکھنا تم اپنے وعدوں کا
ٹوٹ جائے نہ آس لوگوں کی

چند قطروں سے آب کے، ساقی!
بجھ نہ پائے گی پیاس لوگوں کی

افضل ہزاروی

یہ سفر ہے جو زندگانی کا
"اک سمندر ہے رایگانی کا"

قید سونے کے جال میں چڑیا
درد جانا ہے کس نے رانی کا

اتنی جلدی کہاں خمار اترے
نشہ ظالم ہے حکمرانی کا

پُرسکوں اب دکھائی دیتے ہیں
جب سے نکلی بھڑاس لوگوں کی

اِس میں افضل نہ رہ سکیں گے ہم
یہ تو بستی ہے خاص لوگوں کی

یوں نہ لہروں سے بے تکلف ہو
کچھ بھروسہ نہیں ہے پانی کا

نام آتا گیا ترا افضل
راز کھلتا گیا کہانی کا

غزلیں

یہ کیا کہ اب بھی تری گفتگو میں کھو جانا
خیال اوڑھ کے پہلو بدل کے سو جانا

ہمیں فراق اذیت کے ہر فسانے میں
وصال سوچ سے سرشار مست ہو جانا

تمہارے ساتھ ازل سے تھے ہم قدم ہم لوگ
یہ اور بات جدا ہو گئے ہیں تو جانا

کسی بھی وقت اکیلے اداس راتوں میں
انا کے ساتھ ندامت کے داغ دھو جانا

ہمیں تلاش نہ کرنا سفید پھولوں میں
کسی پہاڑ کے دامن میں بیج بو جانا

گداز جسم حرارت فشار لہروں پر
ہوا کے ساتھ کسی اور سمت ڈھو جانا

تمہارے گاؤں کے چشمے ہوئے ہیں خشک مگر
تمہارے اشک نے وادی کو ہے ڈبو جانا

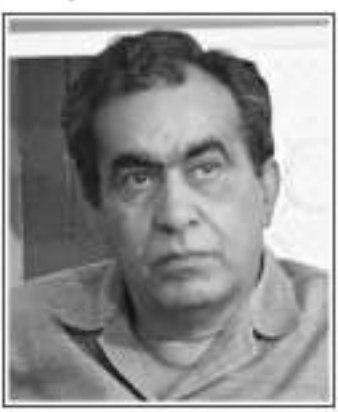

اورنگزیب حسام حر

غزل کہوں تو اترتی ہیں چار سو پریاں
حسین شوخ طرحدار مست خو پریاں

تمام رات کوئی چاند ڈھونڈتا ہے کسے
تمام رات کریں کس کی جستجو پریاں

الٹ کے جام کھنکتی سپردگی بخشیں
اگر حجاب میں ہوتی ہیں بے وضو پریاں

مرے مزاج کی سب شدتوں سے واقف ہیں
مرے وجود سے کرتی ہیں گفت گو پریاں

نشاط وصل سے اٹھ کر کرے ہیں آپس میں
ہر ایک زخم پہ ہنس ہنس کے شست و شو پریاں

بڑھے جو چاند تو جھلمل سے جھیل کی لہریں
دکھائیں رقص کناں زیر آب جو پریاں

ہر ایک عکس شبستاں نگار خانہ ہے
دل و دماغ دکھاتے ہیں کو بہ کو پریاں

کہاں یہ شہر کہ اک پھول بھی نہیں کھلتا
کہاں وہ شہر پشاور وہ مشک بو پریاں

یہ کیا کہ دیکھ رہا ہوں سلگتی آنکھوں سے
فصیل شب پہ چراغوں کی ہاؤ ہو پریاں

غزل

اندھیری شب کے مسافر کی کچھ خبر ہی نہیں
چراغ بجھ بھی گئے اور ہوئی سحر ہی نہیں

جواب کیا دوں تری دشمنی کا، میرے پاس
محبتوں کے علاوہ کوئی ہنر ہی نہیں

ہمیں تمیز سکھائی گئی تھی بچپن میں
ابھی کے بچوں کو اپنے بڑوں کا ڈر ہی نہیں

مری طرح سے کوئی دیکھتا نہیں مجھ کو
کسی کے پاس یہاں مستند نظر ہی نہیں

مجھے غرض ہے گھرانے کی وضعداری سے
مکاں بہت ہیں مگر ان میں کوئی گھر ہی نہیں

ہر ایک لفظ پہ دشمن کا دھیان ہے، لیکن
منافقوں پہ مری بات کا اثر ہی نہیں

ڈٹا ہوا ہوں میں دلشاد آج تک، ویسے
مخالفین نے چھوڑی کوئی کسر ہی نہیں

دلشاد نظمی

غزلیں

ڈھونڈ لو اس کو مرے دل میں کہیں رہتا ہے
ایک عرصے سے وہ گم صُم سا یہیں رہتا ہے

پوچھنے پر یہی سب کو وہ بتاتے رہے ہیں
میرے دل میں کوئی بھی اب کے نہیں رہتا ہے

تم نہ آؤ کہ مکاں خالی نہیں ہے میرا
برسوں پہلے سے یہاں زہر جبیں رہتا ہے

تم کہاں ڈھونڈ رہے ہو اسے یوں دور کلیم
تم جہاں چھوڑ گئے تھے وہ وہیں رہتا ہے

محمد کلیم

کچھ بھی کر لو یہاں لوگوں کو گلہ رہتا ہے
شکوہ کرنے میں بھی ہر کوئی لگا رہتا ہے

جتنا حاصل کوئی کر لے یہی کہتا ہے وہ
زندگی نام اسی کا ہے خلا رہتا ہے

بات دل والی کوئی اب نہیں کرتا یارو
سب کے سینے میں مگر دل یہ دھرا رہتا ہے

کوئی آتا نہیں ملنے مجھے اس بستی میں
جب کہ دروازہ مرے گھر کا کھلا رہتا ہے

ایک دن کی نہیں ہر روز کی تکرار ہے یہ
وہ ہمیشہ ہی بہت دور کھڑا رہتا ہے

بات دل کی اُسے کہنا نہیں آسان کلیم
کتنے رشتوں میں ہی انسان بندھا رہتا ہے

غزلیں

ایک محدود سا تعلق ہے
دیکھا جائے تو کیا تعلق ہے

یہ تو ہر ایک اجنبی سے ہے
جو مِرا آپ کا تعلق ہے

اک طرف ہے لکھا پڑھا رشتہ
اک طرف دلربا تعلق ہے

اُس نے بھی کہہ دیا شناسا ہوں
مَیں نے بھی کہہ دیا تعلق ہے

بھری محفل میں جب سوال ہُوا
پھر تو کہنا پڑا تعلق ہے

دیر سے اُن سے بن نہیں آئی
واہ کیا دیرپا تعلق ہے

دوست محدود کر کے دیکھتے ہیں
دیکھیے کیا مِرا تعلق ہے

عمران ہاشمی

سوچتے ہیں کہ نیا رنگ بھریں
کہنہ افسانے میں کیا رنگ بھریں

ہم سے تو بن نہیں پایا یہ طلسم
آپ کچھ ہوشرُبا رنگ بھریں

آپ تو ہم سے الگ راہ پہ ہیں
آپ تو ہم سے جُدا رنگ بھریں

یہ ورق پیشِ گُلِ تازہ ہے
اِس میں کچھ کھلتا ہُوا رنگ بھریں

شرط یہ ہے نئے اِمکان میں آپ
سات رنگوں سے سِوا رنگ بھریں

خواب میں آ کے وہ تصویر ہُوئے
نیند میں مَیں نے کہا رنگ بھریں

شام خاموش ہے اور بام اُداس
آپ آئیں تو ذرا رنگ بھریں

غزل

مہر علی

اک نئے روپ سے ہر روز ملا دیتا ہے
آئنہ بھی کسی عالم کا پتہ دیتا ہے

چاند تنہائی کا ساتھی ہے ہمارا لیکن
اکثر اوقات یہ تنہائی بڑھا دیتا ہے

روز اک خواب دکھا دیتا ہے آنکھوں کو یہ دل
روز اک فتنے کو سینے میں جگہ دیتا ہے

جب کبھی بڑھنے لگوں خود سے ملاقات کو میں
تیرا ہونا مجھے آواز لگا دیتا ہے

کون اس خواب کی دیوار پہ آ کر ہر شب؟
ایک بے رنگ سی تصویر بنا دیتا ہے

پہلے کرتا ہے شکایت کہ اندھیرا کیوں ہے
میں چراغوں کو جلا دوں تو ہوا دیتا ہے

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

رات بھر کن گیسوؤں کے طاق میں جلتا رہا؟
اے چراغ گل بتا! تیرا شبستاں کیا ہوا؟

غزل

ہوائے سرد تری دشمنی ہے اپنی جگہ
حرارتوں سے مری دوستی ہے اپنی جگہ

ہر ایک شخص کا اپنا مقام ہوتا ہے
فقیری اور ہے پیغمبری ہے اپنی جگہ

بطور مشغلہ یہ کھیل موت کا کھیلا
وگرنہ خوف بھری زندگی ہے اپنی جگہ

وہ مجھ سے روٹھ بھی جائے تو کوئی بات نہیں
اندھیرا اپنی جگہ روشنی ہے اپنی جگہ

خدارا نقل مکانی کا نام مت دو اسے
گھروں کے ہوتے ہوئے بے گھری ہے اپنی جگہ

بہار آنے نہ آنے کا مسئلہ ہی نہیں
پرانے پھولوں کی جو تازگی ہے اپنی جگہ

میں دوڑ دوڑ کے جاتا ہوں خاص راہوں پر
وہ انتظار میں شائد کھڑی ہے اپنی جگہ

تمھارے شہر سے اکتا کے لوٹ جاؤں گا
ہمارے گاؤں میں اب بھی پڑی ہے اپنی جگہ

شہباز حیدر

غزل

گزرا چھو کر مہر محبت
جھانکا اس نے میرے اندر

بے کل ہو کر سمٹ گئی ہوں
اتری جب بھی روح کے اندر

رنگ ملا نہ خوشبو مجھ سے
سہمی سہمی بیٹھی اندر

دل ہے رب کا مسجد مندر
راگ الاپے میرے اندر

چپ کی بولی بول رہی ہوں
جاگ لگایا دکھ کا اندر

شائستہ رمضان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نجمِ غم راہ دکھاتا ہے اسی بستی کی
اسی بستی میں اسیرانِ وفا رہتے ہیں

غزلیں

تو ہر ایک غم کو بچھاڑ کر ذرا مسکرا مرے مہرباں
میں بھی زندگانی کا گیت ہوں مجھے گنگنا مرے مہرباں

تو ہی جان ہے تو ہی مان ہے مری دھڑکنوں کی دھمال ہے
میں نا ڈھونڈ پاؤں گا دوسرا تو ہے اک مرا مرے مہرباں

مجھے ہے خبر کہ طلب ہے کیا تو نہ لب ہلا نہ نظر اٹھا
میں یہیں پہ ہوں ترے پاس ہوں نہ لگا صدا مرے مہرباں

جو رقیب تھے جو رفیق تھے سبھی نامراد چلے گئے
میں مقامِ عشق پہ رک گیا میں ہوں دل جلا مرے مہرباں

مری سوچ میں ہے خیال میں تو ہی سر میں ہے تو ہی تال میں
میں تجھے پڑھوں میں تجھے لکھوں مجھے کچھ سنا مرے مہرباں

ترے عشق میں تری چاہ میں یہ جنوں بنا مرا ہمسفر
مجھے ہوش ہی نہیں کچھ رہا مرے دلربا مرے مہرباں

عزیز قدیر مغل

صاحبِ تختِ سلیمان بنا ڈالوں گا
میں تو اس شخص کو ذیشان بنا ڈالوں گا

تیرے ہونٹوں سے لگے پھول کو اپنا کر کے
ایک ہی گل سے گلستان بنا ڈالوں گا

چاک دامن پہ ہنسیں خود سے ہی باتیں کر کے
ایسی میں حالتِ وجدان بنا ڈالوں گا

خط میں لکھوں گا کے اے شخص تو بس میرا ہے
پھر اسے شاہ کا فرمان بنا ڈالوں گا

وہ جو ہر بات پہ مانگے گا دلیلیں تجھ سے
خود کو اس طرز کا انسان بنا ڈالوں گا

زندگانی ہی پلٹ آتی ہے ہر بار یہاں
اب کے میں موت کو مہمان بنا ڈالوں گا

بھولے آلام سبھی ، تیری خوشی کی خاطر
اپنے کتبے پہ بھی مسکان بنا ڈالوں گا

غزل

کہیں کہیں تو اُداسی کے گل کھلاؤں گا
کہیں کہیں مَیں زمانے کو آزماؤں گا

یہ کائنات مجھے بار بار ملنی نہیں
میں دیکھ بھال کے اگلا قدم اٹھاؤں گا

میں آج ایک نیا عزم لے کے اُٹھا ہوں
میں آج خود سے کہیں دور بھاگ جاؤں گا

میں دیکھ بھال کے آیا ہوں اختتام کی سمت
میں اپنے ساتھ تری خاک بھی اُڑاؤں گا

میں چند لوگ اُٹھاؤں گا اپنی مرضی کے
میں چند لوگوں کو بہتر سے کم دکھاؤں گا

اگر یہ ضد ہے تو پھر ضد سمجھ نوید ، اِدھر
میں آ گیا ہوں تو اب لوٹ کر نہ جاؤں گا

نوید صادق

غزل

بہت سوچا ، بہت سمجھا گیا ہوں
بہت دیکھا ، بہت پرکھا گیا ہوں

کوئی شہکار ہوں مَیں بھی ، جبھی تو
نمائش گاہ میں رکھا گیا ہوں

کوئی مصرف نہیں ہے تو بھی کیا ہے
کہاں تھا اور کہاں لایا گیا ہوں

ہمیشہ سے وہی میں اجنبی ہوں
ہزاروں بار گو آیا گیا ہوں

رہوں گا عمر بھر بچے کا بچہ
"کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں"

نعمان منظور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ واحد دردی ، سب مظلوموں کا
وہ منصوبہ گر ، کل منصوبوں کا

سہہ طرفہ رس بھری ڈالی ___ ڈاکٹر نثار ترابی

ڈاکٹر نثار ترابی کا ادب سے کیا تعلق ہے، کیوں تعلق ہے، اور کب سے تعلق ہے مجھے اُن سوالات سے الجھنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اُن تمام سوالات کا جواب مجھے بہت پہلے اس صورت میں مل چکا ہے جب میں ریڈیو پر سنا کرتا تھا:

سو گلاں دی اکو ای گل
بہتے پانی دا اکو ای حل
نواب ٹیوب ویل نواب ٹیوب ویل

.....

بلکل اسی طرح آج کے جدید ترین دور میں ادب اور ادیب کے بارے میں اٹھنے والے والے تمام سوالات کا جواب تمام مسائل کا حل ایک ہی آواز میں پوشیدہ ہے، اور وہ آواز ہے ڈاکٹر نثار ترابی کی یعنی:

سو گلاں دی اکو ای گل
ہر مسلے دا اکو ای حل
نثار ٹیوب ویل نثار ٹیوب ویل

.....

ڈاکٹر نثار ترابی سے پہلی ملاقات رسالہ فنون کے دفتر میں ہوئی اُن دنوں اُن کی کتاب بارات گلابوں کی، شائع ہوئی تھی - اس مجموعہ میں ماہیے ہی ماہیے تھے گویا یہ مجموعہ مکمل ماہیے کا مجموعہ تھا اور شاید یہ مجموعہ ہم تک پہنچانے یہ خود راولپنڈی سے لاہور تشریف لائے تھے- اس وقت 'فنون' میں جناب احمد ندیم قاسمی تشریف فرما تھے- چند سیڑھیاں چڑھ کر نثار ترابی دفتر میں داخل ہوئے اور پھولی ہوئی سانس اور بڑھی ہوئی عاجزی کے ساتھ جھک کر دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر ندیم صاحب سے ملے، پھر بغل سے ایک کتاب نکال کر ندیم صاحب کو پیش کی، پھر مخاطب ہوئے، ہور کی حال اے، جناب دی کتاب وی میرے کول اے، اے لو- پھر دونوں ہاتھوں پر رکھ کر باقاعدہ نیاز کی طرح مجھے اپنی کتاب عطا کی، میں نے مرید خاص کی طرح بہت محبت سے کتاب وصول کی اور گلے لگا کر مبارکباد دی، اور آج تک اُن کے گلے پڑا ہوا ہوں خیر نثار ترابی نے چائے پی، منہ پر ہاتھ پھیرا اور اجازت چاہی- ندیم صاحب نے یوں پُر جوش انداز

اعجاز رضوی

میں انھیں رخصت کیا جیسے یہ گھر نہیں جنگ پر جا رہے ہوں۔ ''بارات گلابوں کی'' ماہیے کا مجموعہ تھا، اور میں نے پہلی بار اس صنف کو اجتماعی صورت میں دیکھا تھا، سو میں کافی عرصے تک اُن ماہیوں کو پڑھتا رہا، اور سمجھتا رہا کہ یوں ماہیے کا اجتماع کرنے پر نثار ترابی پر باقاعدہ اجتماعی زیادتی کیس بنتا ہے کیونکہ اس کیس کا مکمل فائدہ خود نثار ترابی کے حصے میں آتا ہے، کہ یہ ہمیں تین مصرعوں کے ماہیے دے کر، خود بڑے کاموں میں مصروف ہو گئے اور آج تک مصروف ہی چلے جا رہے ہیں۔

کبھی پتہ چلتا نثار ترابی بڑے نقاد بن گئے ہیں، کبھی سننے میں آتا ہے کہ وہ تحقیق کے آدمی ہیں۔ کوئی فیصلہ کن انداز میں اطلاع دیتا ہے کہ نثار ترابی شاعر ہیں۔ پاکستان کے ادبی حلقے ابھی کسی ایک مقام پر متفق ہوئے ہی تھے کہ یہ کمپیئرنگ، اداکاری، صداکاری فلمکاری اور پرہیزگاری کو دامن میں لیے بہت ساری سمتوں میں مشہور و مقبول ہو گئے۔

اُن دنوں اُن کی کتابوں اور شاگردوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا، اور آج بھی ہو رہا ہے۔

ایک زمانے میں یہ لیکچرار تھے تو لوگ انھیں قابل تقلید سمجھتے تھے۔ اس وقت ان کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا مگر غفور شاہ قاسم، رؤف امیر، افضل پرویز، علی محمد فرشی، علی ارمان، فرخ یار اور اختر شاد جیسے چند نمائندہ لوگ اُن کے قریب تھے انہی احباب کی حوصلہ افزائی پر انھوں نے ماہیے کا مجموعہ 'بارات گلابوں کی' ترتیب دیا۔

اُن احباب نے اس مجموعہ پر لکھا بھی، سینئر احباب میں امجد اسلام امجد، ڈاکٹر جمیل جالبی انور مسعود جیسے مشہور و معروف لوگ بھی ان کی تحسین کیا کرتے تھے۔

مگر نثار ترابی تحسین سے ہمیشہ ایک قدم آگے ہی رہے، اسی لیے کہیں اُن کا تنقیدی کام نظر آتا ہے تو کہیں شاعری۔ اور وہ بھی اردو پنجابی اور پوٹھوہاری، تین زبانوں میں اور تین زمانوں میں۔

یہ کبھی بھی اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔ خاموشی کی حالت میں سوچنا سوچتے سوچتے بولنا، بولتے بولتے لکھنا اور لکھتے لکھتے، کچھ اور نیا سوچنا ان کے چاق و چوبند ہونے کی دلیل ہے۔ نثار ترابی کہیں صدر ہوں یا مہمان خصوصی کی کرسی پر براجمان ہوں، اپنی نگاہ ہمیشہ اپنے بوٹ پر رکھتے ہیں اور یہ اس کو یوں بار بار ٹانگیں پھیلا کر دیکھتے ہیں، جیسے انھیں ڈر ہو کہ کہیں انتظامیہ اُن کے بوٹ ہی نہ اُتروا لے۔

ڈاکٹر نثار ترابی ایک سُر ہے ایک ایسا سُر جن کو سن کر وحشی سے وحشی گھوڑا بھی رام ہو جاتا ہے۔ اب چاہے وہ گھوڑا ادبی ہی کیوں نہ ہو۔ نثار ترابی ایک آواز ہے جو اپنے ہر دوست کے لیے بلند ہوتی ہے اور بلا تکلف کہتی ہے کہ سر جی بہت پیارا بندہ اے، سر جی بڑا ماڑا بندہ اے، مرشدی تھوڑا ہولا رکھو بس اس دا خیال کرو اپنا یار بیلی اے۔ گویا نثار ترابی عام آدمی سے

چند قدم آگے چلتے ہیں اور اپنے آپ کو پیچھے چھوڑ کر اپنے دوست کا ہاتھ پکڑتے ہیں۔ یہ اردو ادب کے اکلوتے ڈاکٹر ہیں جو دادا گیری کے بجائے خبر گیری کرتے ہیں۔

کون بیمار ہے، کون شفایاب ہو کر گھر آ گیا ہے کون ہسپتال جانے والی حرکتیں کر رہا ہے۔ کس نے گولی کھائی ہے، کس نے گولی کھانی ہے۔ کون حکیم کے پاس جا رہا ہے، کس کی شادی ہونی ہے، کسی کے اولاد کیوں نہیں ہو رہی انھیں یہ سب کچھ معلوم ہوتا ہے اور ایسی معلومات کی بنیاد پر ہی وہ اپنا ڈیلی پروگرام ترتیب دیتے ہیں۔

اسلام آباد سے لے کر قبل اسلام تک کا ادب اور ادیب شاعر اُن کی انگلیوں پر ہوتے ہیں شاعر اُن کو نقاد کہتے ہیں اور نقاد انھیں دانش ور دانش ور انھیں واپس گھیر گھار کر شاعر کے ڈربے میں بند کر دیتے ہیں مگر یہ ڈربے کو توڑ کر ہر دائرے کو چھوڑ کر ہاتھ ہلاتے وکٹری کا نشان بناتے آگے نکل جاتے ہیں۔ نثار ترابی اردو ادب کے واحد ڈاکٹر ہیں جو دن میں کئی بار روپ بدلتے ہیں کبھی بیمار لگتے ہیں، کبھی شفاخانہ، کبھی مسافر لگتے ہیں، کبھی مسافر خانہ، کبھی مہمان لگتے ہیں، تو کبھی میزبان اور کبھی صرف چھٹی رساں۔

نثار ترابی کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو محبت ہے، محبت کے اشعار محبت کے مضامین دوستوں سے محبت کا یہ عالم ہے کہ دوست کے اہل خانہ کو بھی رشتوں سے یاد کرتے ہیں، اور سامنے والے کو حیران کر دیتے ہیں۔

جیسے پہلی ہی ملاقات میں فرمائیں گے، ہور سناؤ، بابی بچے کیسے نیں، میرے بھتیجے کیسے نے، اب چاہے دوست بیچارا ابھی تک شادی شدہ بھی نہ ہو مگر یہ بھتیجا بھتیجی کا ذکر ضرور کریں گے۔ پھر ادبی موڈ میں ہوں، تو کہیں گے سر جی، اپنا مرزا غالب اک وڈا شاعر اے تے ساڈی بابی نوں اس نے کدے وی تکلیف نئیں دتی، بچیاں تو بغیر ہی مشاعرے پڑھے نیں۔ سر جی اے میرے نانا میر تقی میر اے، ایہہ وی اک وڈا شاعر اے۔ فیر ویکھو نا جی کدی کار نئیں ملدا، اس لیے میں دس نئیں سکدا کے بابی صاحب اس دے نال خوش سن یا ناخوش پر سر جی خود میر دی ذاتی بابی نے اس دے نال چنگا نئیں کیتا، گویا ہر دور میں جدید و قدیم شعرا کرام سے اس کی رشتہ داری یونہی قائم و دائم رہتی ہے۔

ہور سناؤ، اُن کی فوری گفتگو کا ابتدائیہ ہے، اور یہ اس کو دو تین بار دہراتے ہیں، پھر بات شروع کرتے ہیں لباس کے معاملے میں یہ بہت موڈی ہیں، کبھی معمولی شلوار قمیض پہنے نظر آتے ہیں تو کبھی سوٹ بوٹ میں ہر محفل میں نمایاں رہنا اُن کی ذاتی خواہش ہے مگر یہ ذاتی خواہش آج تک پوری نہیں ہو سکی کے لوگ ہر محفل میں اُن کو پہلے سے ہی اتنا نمایاں کر دیتے ہیں کہ یہ اپنی ذاتی خواہش کو کسی اور دن کے لیے اٹھا رکھتے ہیں، یہ بہت سے ادبی معاملات میں ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے، مگر بات کسی دوست کے فائدے کی ہو تو بڑے بڑے پونڈ کو بھی ساتھ بیٹھا لیتے ہیں۔

نثار ترابی بہت سادہ آدمی ہیں کسی نے

تصویریں ٹرانسفر کرنے کے لیے اُن سے یو ایس بی لانے کی فرمائش کی تو ڈاکٹر صاحب فوراً یو ایس بی خرید لائے اور سادگی دیکھیں کے جب پوچھا گیا کے آپ نے یو ایس بی لانی تھی تو فرمایا یار چھڈو، ہن جو آ گیا اے، اس دے نال کم چلاؤ۔

ڈاکٹر نثار ترابی بال بال گورا ہونے سے بچا ہوا رنگ روپ نزاکت اینڈ شرافت میں گوندھا ہوا چلن اور عام بچوں سے ذرا مختلف بچپن بسر کرنے والے نثار احمد نے زندگی میں کھانا پینا کم رکھا اور پڑھنا لکھنا زیادہ اس لیے ایک خاص عمر تک موٹے ہوئے نہ عینک لگی اور آج کل درمیانی کیفیت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر امجد طفیل سے ذرا لگتا ہوا قد، زبردستی کی مانگ نکالے ہوئے بال اور جسم کو مکمل فری چھوڑ کر چلنے والے نثار ترابی دنیا کے واحد ڈاکٹر ہیں جو خوشکل وصورت سے پیٹ خرابی، کے مریض لگتے ہیں۔ بات کرتے ہوئے اچانک یوں برا سا منہ بناتے ہیں جیسے پیٹ میں گڑگڑ ہوئی ہو۔

نثار ترابی کبھی رنگین ڈیزائن دار کرتے اور سفید شلوار میں نظر آئیں تو سمجھ جائیں کے یہ آج کسی ایم فل والی لڑکی سے مل کر آ رہے ہیں اور اگر یہ کسی دن کالی شلوار قمیض میں نظر آئیں تو سمجھ جائیں کہ آج یہ لڑکی کے بھائی سے ملے ہیں۔

یہ راولپنڈی اسلام آباد اور لاہور میں گھومتے پھرتے بہت سی غزل کہہ لیتے ہیں، مگر جب کبھی سعودی عرب سے واپس آئیں تو ہمیشہ خالی ہاتھ آتے ہیں جب اُن سے سعودی عرب میں غزل نہ کہنے کی وجہ پوچھیں تو کہتے ہیں یار، سعودی عرب وچ پردہ بڑا اے، تے جدوں تک کڑی نہ ویکھو غزل کس طرح ہو سکدی اے۔ نالے سرکٹ جاندا خطرہ وی ہوندا اے۔

یہ کسی ادبی تقریب میں شرکت کے لیے گھر سے نکلیں تو یوں بن ٹھن کر نکلتے ہیں جیسے گھر سے زیارت نکل رہی ہو، دو تین گھنٹے کی ادبی تقریب کے بعد جب یہ گھر جا رہے ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے اکیلے ہی تازیا، اُٹھا کر آ رہے ہیں۔ یہ بات کرنے میں بہت دلیر ہیں، اور کبھی کبھی تو اتنی دلیری دکھاتے ہیں کہ دلیر مہندی لگتے ہیں۔

یہ کسی کو مشورہ نہیں دیتے، اُن کا کہنا ہے کہ مفت مشورہ دینا، اپنی رائے کی فضول خرچی ہے اور یہ کام انھوں نے زندگی بھر نہیں کیا ڈاکٹر نثار ترابی نے بیوی اور ٹی وی دیکھنے کے لیے الگ الگ عینکیں بنوائی ہوئی ہیں کبھی کبھی گھریلو موسم بدلنے کے لیے ٹی وی دیکھنے والی عینک سے بیوی کو دیکھتے ہیں اور فوراً ایک سیاسی تجزیہ نگار بن جاتے ہیں اور بیوی کو پاکستان سمجھ لیتے ہیں۔ یہ دور کی نظر کمزور ہونے پر بھی ڈرائیونگ کرتے ہوئے عینک نہیں لگاتے کیونکہ اُن کا کہنا ہے کہ جب دوسروں نے عینک لگالی ہے تو میں کیوں عینک لگانے میں وقت ضائع کروں۔ وقت ضائع نہ کرنے کے صلے میں ہی رب سخن نے اُنھیں یہ قوت عطا کی ہے کہ یہ وقت کو قابو میں کیے ہوئے ہیں اور جو وقت کو قابو میں رکھے اُسی کو ڈاکٹر نثار ترابی کہتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

مہر

سڑک کی ڈھلوان سے مڑتے ہوئے اس کی نظر آسمان پر پڑی۔ آندھی کے آثار تھے۔ آسمان پر سیاہی آ گئی تھی۔ فضا میں ہلکی سی سرگوشیاں.... تیز ہواؤں کی وجہ سے... آس پاس کے درختوں کے پتے جھڑ رہے تھے۔ چار سو خاموشی اور ہر چیز ہواؤں کے زور میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔ وہ مسلسل اونچی نیچی پگڈنڈیوں سے گزرتے ہوئے تھک گئی... سانس ناہموار ہو گئی... گروسی کا بھرا ہوا تھیلا اٹھاتے اٹھاتے... وہ نڈھال ہو گئی... آسمان کی جانب دیکھا تو مسلسل بادل گرے ہوئے تھے... بارش کی آمد آمد تھی... اس کے قدم تیز سے تیز تر ہو گئے... گو کہ سانس پھولا ہوا تھا۔

میڈم لائیے... آپ کا تھیلا میں اٹھا لوں... رافیہ نے مڑ کر دیکھا تو ایک نوجوان لڑکا اس کی حالت دیکھ کر اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے جان گیا تھا کہ وہ تھک چکی ہے... راستہ بھی غیر ہموار تھا... سڑک اونچی نیچی تھی۔ اس وقت علاقہ نہایت ہی سنسان تھا... رافیہ نے نوجوان کی جانب دیکھا۔

نہایت ہی ہینڈسم ٹی شرٹ اور کالی پینٹ پہنے ہوئے تھا... خاصا مہذب دکھائی دے رہا تھا اگر رافیہ کی مدد اس وقت نہ کرتا تو سڑک کی اترائی میں تمام سامان دور نیچے کھائی میں گر جاتا... رافیہ سوچنے لگی کہ یہ پہاڑی علاقہ جتنا خوبصورت ہے اتنا ہی تکلیف دہ بھی ہے... وہ کھڑے ہو کر اس کی جانب بڑے ہی غور سے دیکھنے لگی۔ ابھی کچھ جواب بھی نہیں دیا تھا کہ وہ کہنے لگا۔

''آپ... مجھ پر بھروسہ رکھیں... تمام سامان حفاظت کے ساتھ آپ کے گھر پہنچا دوں گا۔ اس وقت انسانیت کے ناطے آپ کی مدد کرنا میرا فرض ہے''۔

رافیہ نے اس کو تھیلا پکڑاتے ہوئے ایک بار پھر دیکھا... اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں... اور لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''آنٹی'' رافیہ متوجہ ہوئی محبت بھری نگاہوں سے دیکھا... اور کہا۔

''تم کتنے اچھے ہو... یوں لگتا ہے کہ تمہاری ماں نے تربیت بہت اچھی کی ہوئی ہے''۔

''جی... آنٹی... وہ ہمیشہ کہتی ہیں کہ دوسروں کی مدد کرنے سے اللہ بہت خوش ہوتا ہے''۔

بلقیس ریاض

''کہاں رہتے ہو؟''

''جی میں''...اس نے رافیہ کی جانب دیکھا اور کہا...وہ اوپر پہاڑی کے جو بنگلے ہیں...بس ان میں سے ایک میں میرا گھر ہے۔

''ارے واہ''

''وہاں پر ہی تو میں جارہی ہوں''۔

وہ یکدم سے خوش ہوتے ہوئے گویا ہوا...

''پھر تو بڑی اچھی بات ہے...ہم دونوں کی منزل ایک ہی ہے''۔

رافیہ نے چلتے چلتے پوچھا۔

''پڑھتے ہو؟''

''جی آنٹی...میں بی اے کے آخری سال میں ہوں...اور...چھٹی کے بعد اپنے گھر جارہا تھا''۔

کتنے بہن بھائی ہو؟

میں اکیلا بیٹا ہوں...بہنیں دو ہیں...وہ مجھ سے چھوٹی ہیں...ایک ایف اے میں اور دوسری میٹرک میں۔

سڑک کی اترائی کے بعد...چڑھائی شروع ہوگئی اور وہ تھکے قدموں سے اوپر چڑھنے لگی...ناہموار سانس کو قابو کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''آصف''

''اچھا نام ہے''۔

''آنٹی آپ سیر کے لیے یہاں آئی ہیں یا مستقل یہاں رہتی ہیں''۔

بیٹا...میں ہر گرمیوں کے موسم میں یہاں آجاتی ہوں...اور پورا سیزن یہاں فلیٹ لے کر گزارتی ہوں...لاہور میں تو جھلسا دینے والی گرمی ہے...مجھے بلڈ پریشر رہتا ہے...اور ویسے بھی یہاں کے اچھے موسم کی وجہ سے صحت برقرار رہتی ہے۔

''آنٹی آپ اکیلی ہی ہیں...بچے ساتھ نہیں ہیں''۔

بیٹی کی شادی کردی ہے اور بیٹا باہر کے ملک میں پڑھنے کے لیے چلا گیا ہے...ہم دونوں میاں بیوی ہی ہیں۔

اس سنسان علاقے میں آنٹی کسی مزدور کو اپنا سامان پکڑا دیتی۔

''تم یقین مانو...ہمیشہ مزدور ساتھ ہی ہوتا تھا مگر...آج کہیں سٹور کے باہر نظر نہیں آیا...بارش کا امکان بھی تھا...شاید اس وجہ سے نظر نہیں آیا''۔

آئندہ اکیلی مت آئیں کسی نہ کسی کو ساتھ مدد کے لئے لے جایا کریں یہاں پر تو بہت غربت ہے...تھوڑے سے پیسوں سے ہی آپ کو اوپر پہنچا دیتے...خیر...آپ یوں لگتا ہے کہ بہت نیک ہیں...اس مشکل کے وقت میں اللہ نے آپ کی مدد میرے ہاتھوں سے کروائی ہے...میں بہت خوش ہوں آپ کی مدد کر کے مجھے سکون مل گیا ہے۔ آپ اپنا فون نمبر لکھوا دیں جب بھی ضرورت ہو میں آجایا کروں گا۔

''جیتے رہو''...اور رافیہ نے اپنا نمبر دے دیا۔

رافیہ نے آسمان کی جانب دیکھا...تو بادلوں کی کڑک جاری تھی...اور آصف مسلسل اس کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ اور قدم کے ساتھ قدم بڑھاتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔

رافیہ کا فلیٹ ایک پہاڑ کے اوپر تعمیر ہوا تھا۔ جہاں سے کچھ فاصلے پر ندی تھی۔ پہاڑی کی ڈھلوان سے ایک پگڈنڈی نیچے ندی تک جاتی تھی.. ندی کے چند فاصلے پر کچھ رہائشی گھر تھے... جہاں غریب غربا رہائش پذیر تھے۔

گہرے بادل چھائے تھے.. فضاؤں میں ہلکی ہلکی تاریکی اور سردی تھی۔ ہوائیں مسلسل تیز چل رہی تھیں... رافیہ جس وقت سٹور میں گروسری لینے کے لیے پہنچی تھی تو اس وقت خاصی دھوپ تھی.. گمان ہی نہیں ہوا تھا کہ موسم یکدم سے بدل جائے گا... اور... وہ... مشکل میں گرفتار ہو جائے گی.. مگر اس لڑکے کی وجہ سے بہت مطمئن ہو گئی تھی... درخت جھوم رہے تھے... کہیں کہیں پھولوں کے پودے تھے... چاروں طرف خوشبو فضا میں پھیلی تھی۔

یکدم موسلا دھار بارش ہونے لگی... گرج چمک کے ساتھ... وہ دونوں پہاڑ کے نچلے حصے میں ایک بنگلے کے پورچ میں پڑے بینچ پر بیٹھ گئے... رافیہ نے شکر کیا کہ اس کو بروقت پناہ مل گئی... چاہتی تو گھر کے مکین سے پناہ لے سکتی تھی مگر... مگر اس ڈر سے پناہ نہ لی کہ کوئی گھر کا دروازہ ہی نہ کھولے کیونکہ حالات آجکل بہت سنگین تھے لیکن اس نے وہاں بیٹھنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی اب دونوں ہی بارش سے محفوظ ہو گئے تھے... بس تھوڑی سی چڑھائی کے بعد اس کا فلیٹ آجانا تھا... مگر اس وقت اس سنسان علاقے میں وہ بڑی مطمئن بیٹھی تھی... سوچنے لگی کہ اللہ نے رحمت کا فرشتہ بھیج دیا ہے... پھر... یکدم آصف سے مخاطب ہوئی نہ جانے یہ بارش کب ختم ہو گی۔

''بس دس پندرہ منٹ میں... آپ کیوں فکر کرتی ہیں... میں ہوں نا''!

رافیہ نے پیار بھری نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔

''اللہ تمہیں اور بھی اعلیٰ انسان بنائے... دوسروں کی خدمت کرتے ہو... نہ جانے اللہ تمہیں کتنا اجر دے گا''۔

رافیہ کو جواب دیتے ہوئے بولا۔

''آنٹی آپ بس میرے لئے دعا کریں میں بڑا آدمی بن جاؤں... اللہ سے میرا وعدہ ہے کہ میں اس کی مخلوق کی بہت خدمت کروں گا''۔

ان شاءاللہ مجھے پورا یقین ہے کہ تم ایک نہ ایک دن بہت بڑے مقام پر پہنچ جاؤ گے۔ رافیہ کی بات سے آصف نے خلاؤں میں گھورنا شروع کر دیا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

وہ یکدم سے بوکھلاتے ہوئے چونک اٹھا۔

''اوہ... میں سوچ رہا تھا کہ امی میرا انتظار کر رہی ہوں گی''۔ رافیہ نے یکدم آسمان کی جانب دیکھا تو بارش بند ہو گئی تھی... اور دونوں اس پورچ سے نکلے اور اوپر چڑھائی پر قدم جما دیئے.. آنٹی آپ آرام آرام سے اوپر آئیں بہت پھسلن ہے۔

آصف لاؤ تھیلا میں پکڑلوں تم تھک گئے ہو گے۔

نہیں... آنٹی بالکل نہیں تھکا... بس آپ آرام سے اوپر آئیں... آصف تیزی سے اوپر چڑھنے لگا... پہاڑی کی دوسری طرف اترائی تھی... اور

سیدھا راستہ اوپر فلیٹ کی طرف جاتا تھا... رافیہ سنبھل سنبھل کر اوپر چڑھ رہی تھی... اور آصف جھٹ سے نظروں سے اوجھل ہو گیا... اس نے شکر کیا کہ وہ فلیٹ تک پہنچ گیا ہے... وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتے اوپر آئی تو آصف نہ جانے کہاں چلا گیا تھا... وہ فلیٹ کے باہر کھڑی تھی پھر اس نے کال بیل دی تو اس کے شوہر اسلم نے دروازہ کھولا۔

"میں بہت فکر مند تھا"۔

شکر ہے... پہنچ گئی ہوں... نہ جانے وہ لڑکا کہاں چلا گیا ہے... اس نے میری بڑی مدد کی ہے۔

کون لڑکا میاں نے حیرت سے پوچھا۔

وہی جو میرے ساتھ تھا سارا سامان اسی نے اٹھایا ہوا تھا۔ وہ کافی دیر دروازے کے باہر کھڑی چاروں طرف نگاہیں دوڑاتی رہی مگر آصف کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ بڑی دلبرداشتہ ہو کر وہ گھر کی دہلیز پر کھڑے ہو کر سوچنے لگی... کہاں چلا گیا ہے... ابھی سوچ بچار کر ہی رہی تھی کہ اسلم نے اسے اندر بلاتے ہوئے کہا۔

وہ سامان سمیت روپوش ہو گیا ہے... کیوں وقت ضائع کرتی ہو... میں ضروری کام سے نہ جاتا تو تمھارے ساتھ گروسی ضرور کر لیتا مگر... کام بہت ضروری تھا۔

رات بھر رافیہ پریشان رہی... دوسرے دن وہ سو کر اٹھی ہی تھی کہ آصف کا فون آ گیا۔

"آنٹی میں بہت معذرت چاہتا ہوں... جتنی بھی ہمارے درمیان باتیں ہوئی وہ سب سچ تھیں... ایک ہفتہ ہو گیا ہے... میرے ابو فوت ہو گئے تھے... جتنا بھی اثاثہ تھا سب ان کی تجہیز و تکفین پر لگ گیا... کچھ روز تو لوگوں نے کھانے بھیجے مگر چار دن کے بعد ہمارے گھر میں فاقے تھے... چولہا ٹھنڈا ہو گیا تھا... میں بہت شرمندہ ہوں... آپ سے وعدہ کرتا ہوں... جب بھی کچھ بنا تو آپ کے احسان کا بدلہ ضرور چکاؤں گا۔ اس غربت اور مہنگائی سے میرے قدم بہک گئے... میں مجبور تھا کوئی مدد کرنے والا نہیں تھا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ پہلی دفعہ اس قسم کی حرکت کی ہے۔ میں نے اس سے پہلے کوئی ایسا کام نہیں کیا۔ واقعی والدہ کی تربیت بہت اچھی ہے جب مجھ سے انھوں نے پوچھا تو میں نے بتایا سب چیزیں ادھار لے کر آیا ہوں... اگر سچ کہتا تو وہ ان چیزوں کو ہاتھ نہ لگاتیں... آپ کو کیا علم کے میرا ضمیر کتنا غیر مطمئن ہے... میں اللہ کا بھی اور آپ کا بھی مجرم ہوں... مجھے معاف کر دیں... آپ یہ جان لیں یہ چیزیں آپ نے ادھار دی ہیں اور آپ کا قرض ہے مجھ پر... میں اس گروسری کی رقم ضرور ادا کروں گا۔

رافیہ یہ باتیں سن کر کچھ بولے بغیر فون بند کر چکی تھی۔ ایک بار پھر باہر طوفان آ گیا تھا۔ موسلادھار بارش شروع ہو گئی تھی... کھڑکی کے پٹ پھڑ پھڑا رہے تھے... اور رافیہ... انجانے میں سوچ رہی تھی... شاید اللہ نے اس گروسری میں ان لوگوں کی مہر لگا دی تھی۔

☆☆☆☆☆

پتھروں کے درمیان

فرخندہ شمیم

میں نے ابھی چند دن پہلے ہی پرانا محلّہ چھوڑا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں محلّہ بدلنا نہیں چاہتی تھی اس محلے میں میرے پاس دولت اور شہرت بہ مقدار تھی اور آپ جانیے ان دونوں شرابوں کا نشہ کہاں کچھ بدلنے دیتا ہے؟ لیکن کسی طاقتور کے حکم پر مجھے ایسا کرنا پڑا تھا، میں نے کوئی جرم بھی نہیں کیا تھا کہ جس کی پاداش میں مجھے اپنا دلربا گھر اور دلدار محلّہ چھوڑنا پڑا، وہ بس ایک حکم تھا اور میں اس حکم کی تابع تھی، لوگوں کا خیال تھا میں نے کسی کی چاہت میں اس کا حکم مانا ہے اور جس کی الفت میں محلّہ بدری لی ہے وہ مجھ سے عشق کرتا ہے اور اس عشق کے ہاتھوں مجھے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے، اگر یہ بات سچ ہے تو اتنی جلیل ہستی کی جانب سے یہ اعزاز میرے لیے بہت ارفع تھا۔ یہ رفعت نہ تو مجھے پدرسری میں ملی تھی ورنہ مادر سری میں، میں ہر قرن میں رہ کر آئی تھی اور سب کچھ جانتی تھی.....

بہرحال جس محلے میں، میں حال ہی میں منتقل ہوئی تھی، وہاں میرے بہت سے واقف پہلے سے آباد تھے، ان میں کچھ تو اسی تازہ قرن کے تھے کیونکہ انٹرنیٹ پر واقف ہوتے تھے.....البتہ نیٹ پر تو ان کا تعارف

بڑا شاندار تھا اور یہاں وہ بڑے واجبی سے رہ رہے تھے..... کیا وہ پچھلے محلے میں کوئی بڑا نقصان کر بیٹھے تھے جو آج یوں زبوں تھے؟

میں دیر تک اُلجھی رہی تھی۔

محلے کا راونڈ لگاتے لگاتے اچانک مجھے پرانے محلے کی ایک معمولی عورت مل گئی جو اپنے گھر میں مسلمان بچوں کو الہامی کتاب پڑھا کر اپنی اور اپنی بے اولاد بیوگی کو پال رہی تھی، جس کا حسن خیرہ کن تھا اور معاشرہ اس کے جمال کو کمال کا جھانسہ دے کر اس کے کواڑ بجاتا رہتا تھا، لیکن وہ بھی کسی دستک کا جواب نہیں دیتی تھی۔

اس محلے میں وہ کب شفٹ ہوئی اور ایسا کیا ہوا کہ اس کے حالات پلٹے اور وہ کٹیا سے نکل کر ایک شاندار کوٹھی میں منتقل ہوگئی۔ میں جاننا چاہتی تھی لیکن اس کے ماہتاب رو کے سامنے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کرسکی..... وہ مسکراتی ہوئی اپنے شاندار محل کے اندر چلی گئی.....اور میرے اندر طرح طرح کی بدگمانیوں نے سر اٹھا لیا لیکن یہ بدگمانیاں کسی سحر کی طرح جلد ہی زائل ہوگئی کیونکہ عورت کے محل میں سے وہی قرأت آوازیں آرہی تھیں جو پچھلے محلے میں اس کی کٹیا سے آتی تھیں... مجھے پورا محل الوہی محسوس ہونے لگا میں شرمسار سی ہوکر آگے بڑھ گئی۔

محلے میں دور دور تک گھر ہی گھر تھے، کچھ چھوٹے، کچھ بڑے، کوئی یک منزلہ تو کوئی سہ منزلہ بھی، ایک مکان کی نیم پلیٹ تو گھر کے رقبے سے بھی بڑی تھی، سفید سنگ مرمر کا گھر تھا اور بہت خوبصورت، میں اس کے مالک کو جانتی تھی، سابقہ محلے میں بھی وہ بہت پیسے والا تھا اور ہر ہاؤسنگ سوسائٹی میں اس کا ایک ایک گھر تھا... وہ اپنے بھرے پرے اہل وعیال کے ساتھ مختلف گھروں میں سیزن گذارتا اور موسموں سے لطف اندوز ہوتا تھا، لیکن آج یہ اکیلا کیوں ہے؟ اس کے عیال کہاں ہیں؟ دروازے پر کوئی چوکیدار بھی نہیں ہے؟ گھر والوں نے اسے کہیں چھوڑ تو نہیں دیا یا یہ خود سب کو چھوڑ آیا ہے؟

اتنی خاموشی؟

مجھے بہت وحشت ہوئی..... یہ شخص تو ایک جانا مانا اور پروھاک آدمی تھا، ایک دنیا اس کے پیچھے اپنے کاموں کی درخواستیں لیے پھرتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ بھاگتا ہوا اس کا سیکرٹری لوگوں کی عرضیاں جمع کرتا جاتا تھا اور خود ہی ان سے جھوٹے وعدے بھی کرتا رہتا تھا..... لیکن آج کوئی سائل اس کے پیچھے نہیں، تھا آج تو وہ خود ایک سوالی لگ رہا تھا؟

اچانک مجھے اس خاموش محلے میں شور سنائی دیا بہت سے لوگ ایک گھر کے آس پاس جمع تھے۔ ان کے ساتھ مزدور بھی تھے جن کے

ہاتھوں میں بھاری کدالیں تھیں... وہ جو لوگ کدال والوں کو ساتھ لائے تھے باہم بھائی، بھتیجے تھے اور ان کا خیال تھا کہ ان کا باپ اولاد کے درثے کی تمام جائیداد لے کر اس محلے میں آن چھپا ہے اور جواہرات زمین میں دفن کر دیئے ہیں..... بیٹے سخت برہم تھے اور مزدوروں کو تیز تیز کدال چلانے کی تلقین کر رہے تھے..... ان کے ہاتھ میں اس گھر کو ڈھانے کا ایک قانونی پرمٹ بھی تھا... لیکن لمبی کوشش کے باوجود بیٹوں کو اس گھر میں سے خاک کے علاوہ اور کچھ نہیں ملا اور وہ سانپوں کی طرح پھنکارتے ہوئے واپس لوٹ گئے..... میرا چہرہ پسینے سے بھر گیا..... مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ..... ان لڑکوں کے باپ نے بیٹوں کو سب کچھ کیسے کرنے دیا، کوئی مزاحمت نہیں کی، اس کے باوجود ایک لڑکے نے کدال باپ کے منہ پر دے ماری جس سے اس کا سفید لباس اور ساکت جسم بھوری مٹی سے اٹ گیا لیکن باپ خاموش رہا..... میں دل گرفتہ اپنے گھر لوٹ آئی.....

اگلی شام محلے میں بڑے بڑے بینرز دیکھنے کو ملے..... نوجوان رنگین قمقموں اور جھنڈیوں سے ایک گھر کی تزئین کر رہے تھے..... مقدس کتاب کی نقول اس گھر کے اندر رکھ دی گئی تھیں اور لوگ تلاوت کر رہے تھے..... اس گھر کے مکین ایک بہت بڑی اور برگزیدہ ہستی تھے جو اپنے خانوادوں کے ساتھ اس وسیع گھر میں مستقل رہتے تھے..... ان کے اور ان کے خاندان والوں کے پاس بس ایک ایک کمرہ تھا جن کے باہر اگربتی اور لوبان کی خوشبوئیں جلتی رہتی..... اس محلے میں ان کی موجودگی باعث رحمت سمجھی جاتی تھی..... میں نے کمال عقیدت سے اس گھر کو دیکھا..... پچھلے محلے میں، میں ایک لکھاری تھی لیکن اب قلم اور قرطاس کی مدت ختم ہو چکی تھی..... اور ذہن واپس لے لیا گیا تھا۔

میں نے ڈبڈبائی نظروں سے اپنی آنکھ کو قلم بنا کر ایک منقبت بزرگوں کے گھر کی بیرونی دیوار پر چھاپ دی اور اپنے گھر لوٹ آئی۔

مجھے اطلاع ملی تھی کہ میرے کچھ رشتے دار میرے لیے دعا کرنے میرے گھر آ رہے ہیں..... پھول ان کے ہاتھ میں ہیں اور عطر بھرے گل پاش انھوں نے راستے سے خریدے ہیں..... مجھے مسرت نے آن گھیرا، میرا گھر میرے پچھلوں کی دعا سے اب پرسکون ہو جائے گا، ورنہ تو کئی گھروں کے اندر من من بھر ماتم سے رونے کی آوازیں میں نے خود سنی تھیں۔

میں نے ایک نگاہ محلے پر ڈالی، ایک سکوت دور دور تک سو رہا تھا..... جسے دیکھ کر..... میں بھی پرسکون ہو گئی تھی۔

☆☆☆☆☆

باجی

رخشندہ نوید

وہ اپنے بستر پر اوندھے منہ ترچھے رُخ ایسے پڑی تھیں جیسے کسی کو گلے لگایا ہو- دونوں بازو اپنے سینے سے باندھے وہ اس دنیا کو جوتی مار گئی تھیں- باجی دراصل نہایت عجیب اور منفرد عورتوں میں سے ایک تھیں- موت بھی اُنھیں اس کی حسب منشا ہی آئی-

دروازہ توڑنے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ وہ علی الصبح اُٹھنے کی عادی تھیں- نماز، قرآن کے بعد انھوں نے اونچی آواز میں ریڈیو یا ٹی وی پر نعتیں سننے کو معمول بنا رکھا تھا- گھر کے آگے پیچھے کے برآمدوں کی بتیاں بجھانے تک وہ سورج کو روکے رکھتیں تھیں-

آج جب شازی سیڑھی اُتر کر نیچے آئی اُس پانی کی موٹر کو آن کرنے جس کا پانی اس وقت تک اوپر نہ چڑھتا تھا، جب تک کہ نیچے کے باتھ روم کا ایک نلکا نہ کھولا جاتا، اسے نیچے کے معمولات میں فرق محسوس ہوا- اس نے دیکھا کہ پیچھے کے برآمدے کی لائٹ آن ہے- دروازہ بند ہے، وہ اور بھی حیران ہوئی کہ امی کے کمرے کا اے سی چل رہا ہے، وہ بھی صبح کے سات بجے تک!

زمین اس کے پیروں تلے سے سرکی، اس نے دروازے کھٹکھٹائے، بار بار آوازیں دیں- امی، امی دروازہ کھولیں-

بے حرکت ماحول میں کوئی تبدیلی نہ آئی، وہ بھاگی بھاگی اوپر گئی، ''اویس امی دروازہ نہیں کھول رہیں، جلدی چلیں-' 'چلیں نا چلیں نا'، اس نے سوئے ہوئے اویس کی قمیض پکڑ کر جھنجھوڑی-

شازی فطرتاً ڈرپوک اور کمزور واقع ہوئی تھی- جلد گھبرا جانا اس کی حسیات میں شامل تھا- وہ تھر تھر کانپ رہی تھی- اویس نے بھی آ کر دروازے کو پوری طاقت سے پیٹا لیکن دونوں کی آوازیں بھی دروازہ نہ کھلوا سکیں-

دروازہ توڑنے پر معلوم ہوا- 'باجی نہیں رہیں-' ابھی کل شام شازی نے انھیں فرنٹ صحن میں بیٹھے دیکھا تھا- وہ خاص طور پر نیچے اُتری تھی اور امی کو سمجھانے کو کوشش کی تھی کہ بہت گرمی ہے اندر چلی جائیں لیکن انھوں نے حسب عادت اونچی آواز میں کہا تھا- 'نہیں سب ٹھیک ہے! تم چلو-

رات کو وہ سوئیں اور سوتی ہی رہ گئیں- کسی کو نہیں معلوم- رات ان پر کیا بیتی- ہارٹ اٹیک، برین ہیمرج، نروس بریک ڈاؤن یا گرمی جس سے ان کا دم گھٹ گیا- ان کی موت پر آنے والوں نے جب ان کے کمرے کا اے سی لگایا تو کیا دیکھا کہ یہ اے سی نہیں، ہیٹر ہے- اس میں گیس نہ جانے کتنے برسوں سے ختم ہو چکی تھی-

یہ والا اے سی پچھلے 30 برس سے اسی کھڑکی میں نصب ہے، جس کی عمر یوں بھی پوری ہو چکی تھی- بلکہ اس گھر میں پڑی تمام اشیاء، فرنیچر، ڈیکوریشن کے بلی، کتے، فریم میں لگی سالہا سال پرانی تصاویر، شوکیس میں نہایت اعلیٰ کراکری، اسی حالت میں انھیں مقامات پر دھری ہیں-

ہمارے بہنوئی حئی صاحب لیبر انسپکٹر ہوئے تو ان پر خدا کی خوب رحمت ہوئی- وحدت کالونی کے کوارٹرز میں بہت سے برس گزارنے کے بعد انھوں نے وحدت روڈ پر اپنا گھر بنا لیا- دونوں بیٹیوں اور حئی صاحب کے ساتھ اس گھر میں وہ تقریباً 25/20 سال رہیں- حئی صاحب شاید رشتے میں ہمارے سیکنڈ کزن کے برابر تھے- نجمی باجی کو اکثر ان کی بڑی بہن آپی اور ان کی خالہ کہا کرتے- نجمی ایک بیٹا پیدا کر لو- لیکن وہ بڑی بری شکل بناتیں- یا پھر ہنس کر کہتیں- 'دفع کرو خالہ! کیا کرنا ہے- وہ تو اپنی موجودہ اولاد یعنی اپنی دونوں بیٹیوں کے لیے بھی بڑی سخت مزاج ماں تھیں- دونوں بیٹیاں ان کی آنکھ کے

اشارے کو سمجھتی تھیں- بچپن میں گھر میں پڑے بسکٹ اور نمکو جو صرف مہمانوں کے لیے پڑے ہوتے پتھر بن جاتے مگر انھیں کھانے کا حکم نہیں تھا- پوچھے بغیر کچھ بھی کھانا ان کے لیے ناممکن تھا-

نجمی باجی کی تعزیت کے لیے آنے والے اکثر لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ وہ اکیلی کیوں رہتی تھیں- ان کے شوہر حئی صاحب کہاں تھے- اگر ان کی بیٹی اوپر کے پورشن میں تھی تو ماں نے تکلیف کے وقت اس کو آواز کیوں نہ دی- اوپر والوں کو کیوں علم نہ ہو سکا کہ نیچے 47 درجے کی گرمی میں اے سی آگ پھینک رہا ہے اور کمرے کے سارے دروازے بند ہیں-

نصرت باجی سے میری آخری ملاقات میری امی کے گھر تقریباً ڈیڑھ ہفتہ قبل ہوئی تھی- وہ پہلے سے زیادہ کمزور تھیں- لباس بھی معمولی تھا- پاؤں میں ربڑ کی ستر اسی روپے والی گھر کی جوتی تھی- جس کی تھوڑی سی ہیل ہوتی ہے- لال لپ اسٹک کی محض باقیات ہونٹوں پر پپڑی کی طرح جمی تھیں- آنکھیں سفید سفید سی تھیں- وہ کچھ عرصے سے سرمہ ٹائپ کوئی چیز آنکھوں میں استعمال کرتی تھیں- زندگی کی اس اسٹیج پر ان کے پاس ٹھیک ٹھاک بینک اکاؤنٹ تھا لیکن اس دن ان کا حلیہ غریب سی عورت جیسا تھا-

صوفے پر بیٹھی ہوئی وہ مخبوط الحواس سی لگ رہی تھیں- باتوں میں بھی تھوڑا سا بہکا پن ظاہر ہو رہا تھا لیکن وہ اپنی دھن میں بولے جا رہی تھیں- اور روئے جا رہی تھیں- بالکل بچوں کی طرح منہ بنا بنا کر، پرس سے رومال نکال کر ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا اور بار بار آنکھیں پونچھتی تھی

(ایمان سے) کافی عرصے سے ان کا تکیہ کلام تھا-

'ایمان سے خالہ اس بندے نے مجھے بڑی عیش کرائی ہے ساری زندگی' وہ بہت نیک انسان ہے- اس روز حئی صاحب کا ذکر ان کی ہر بات کا موضوع تھا- بات حئی صاحب سے شروع ہو رہی تھی ان پر ختم-

خالہ ابھی ہفتے کو آئے تھے اوپر سے سیڑھیاں اُتر کر گاڑی میں بیٹھ رہے تھے- شازی مجھے آوازیں دے رہی تھی- امی جلدی آئیں- ابو جا رہے ہیں- آ کر مل لیں-

میں نکل کر باہر مین گیٹ پر آئی، ہاتھ میں بریف کیس پکڑے حئی صاحب ہمیشہ جیسے شاندار اور حسین لگ رہے تھے- بڑا اعلیٰ لباس تھا- خالہ میں نے انھیں دیکھ کر دور سے اپنے بازو پھلا دیے- بڑے عرصے بعد

میں 5 منٹ تک ان کے گلے لگی رہی۔ روتے روتے وہ اس ملاقات کی روداد سنائے جا رہی تھیں۔ ان کا رنگ سیاہ سے سیاہ تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت میں نے دیکھا وہ حئی صاحب کا نام لے کر اتنی تکلیف محسوس کر رہی تھیں جیسے کوئی ان کے سینے میں خنجر اتار رہا ہو۔ ہر آنسو کے ساتھ ایک ہائے بھی نکل رہی تھی۔

خالہ جی، ایمان سے آج بھی میری الماری نوٹوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہر مہینے کی پہلی کو آٹھ دس ہزار روپیہ مجھے بھیجتے ہیں۔ اس نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ خالہ خدا میری زندگی میں مجھے اس کا دکھ کبھی نہ دکھائے۔ میں اس سے پہلے مروں۔ بڑی شاندار موت آئے مجھے۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔ کوئی مجھے ہاتھ نہ لگائے۔ میں کسی کی محتاج نہ بنوں۔

خالہ اس شاذو سے تو میں کبھی مدد نہیں لینا چاہتی۔ خدا میری موت خاموشی کی موت بنائے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ لگے سب پوچھتے ہی رہ جائیں آخر ہوا کیا۔ (ایمان سے) کہہ کر وہ دائیں طرف سر کو ہلایا کرتیں۔

کچھ عرصے سے اکثر وہ اپنی موت کی باتیں کرتی تھیں۔ دیکھا جائے تو وہ کئی سال سے زندگی کے آخری سال گزار رہی تھیں۔ انھوں نے کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے سنی جاتیں 'ایمان سے اس زندگی میں بڑا سکون ہے، بڑا مزہ ہے۔ میں نے اپنے اللہ سے لو لگائی ہوئی ہے۔ میں کبھی ہزار دو ہزار سے کم تسبیح ورد نہیں کرتی۔ دن بھر میں پورا پنسورہ اور نہ جانے کتنے سپارے پڑھ لیتی ہوں۔

نہ کوئی جھنجھٹ ہے۔ صاف ستھرا گھر ہے، وہ کہتی تھیں سوی کے بچے آئیں تو میں انھیں کہہ دیتی ہوں گند ڈالنا ہے تو نکل جاؤ میرے گھر سے! اور شازی کے بچے تو ان کے گھر پھٹک بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ شازی سے ان کا رشتہ ماں بیٹی نہیں بلکہ ساس بہو سے بھی بدتر ہو چکا تھا۔ آخری چند سالوں میں تو شازی نے خوب بددعائیں بھی لیں اور بدنامی بھی اٹھائی۔ لگتا یوں تھا ان کا شازی سے Personality Clash تھا۔ باجی دراصل بے جی کی طرح اکھڑ مزاج تھیں تو شازی بھی ان کی بڑی والی بیٹی تھی اس کے خون میں بھی ہٹ دھرمی موروثی تھی۔ باجی بھی تو اکثر گھر میں گالم گلوچ اونچی اونچی بددعائیں دینے پر اتر آتی تھیں۔ سال بھر پہلے شازی کو گلی سے اینٹیں اٹھا کر مارنے لگیں تھیں۔ اسے بری بری گالیاں دیں تو شازی ڈر گئی اور

ایسی بدظن ہوئی کہ سال بھر اس نے بھی باجی کا حال چال نہ پوچھا- نہ ہی یہ سوچا کہ وہ کس حال میں ہیں-

دیوار سے دیوار جڑے گھر کی ہمسائی نے اس جھگڑے کا خوب فائدہ اٹھایا- نچلی باجی سے خوب پیسے اینٹھے- دو روٹی اور سالن کے بدلے بہت بڑی رقم مہینہ وار لیتی رہی اس سے پہلے شازی ٹرے لگا کر تین وقت کا کھانا نیچے لاتی لیکن باجی اس کھانے میں سو کیڑے نکالا کرتیں، کھانا پھینک دیا کرتیں- اور کھانا لے کر جانے والے کی شامت آئی رہتی تھی-

مجھے وہ زمانہ بھی یاد ہے جب شازی اور میں ہم عمر ہونے کی وجہ سے گہری سہیلیاں تھیں- بچپن میں باجی کے گھر چھٹیاں گزارنے کی اجازت مجھے تو مل جاتا کرتی تھی، باجی کے گھر کے مزے دار چٹخارے دار کھانے مجھے آج بھی یاد ہیں- حئی صاحب کھانے پینے کے معاملے میں اعلیٰ ذوق کے مالک تھے- کریلے، بھنڈی اور آلو گوشت کا ذائقہ دار شوربا جو مصالحہ گوشت ہی ہوتا تھا میری زبان کو اکثر یاد آتا ہے-

لیکن دسترخوان پر بیٹھے بیٹھے باجی اور حئی صاحب کی کسی معمولی بات پر لڑائی شروع ہو جایا کرتی تھی- تو تو میں میں اور پھر جھگڑا طول پکڑ جاتا تھا- شازی سوی سہم جایا کرتی تھیں- امّی کو سمجھانے کی ان کی کیا مجال تھی- حئی صاحب اکثر مجھے مخاطب کر کے میری باجی کی شکایتیں مجھ سے کیا کرتے تھے- اکثر مجھے ثالثی بنا کر رائے مانگتے کہ بتاؤ یہ غلط ہے یا درست اور میں اپنی ننھی سی عقل سے سوچتی رہ جاتی تھی-

حئی صاحب کہتے کہ تیری باجی کے مزاج میں وہی بے جی والی ہوڑ ماریاں ہیں جو اس کے دماغ میں آ جائے وہ اس نے چھوڑنا کہاں ہے" اس زمانے میں ان کے گھر باہر کے ملک سے مہمان آیا کرتے تھے جن کی بڑی خاطر مدارت ہوتی- حئی صاحب بھی دو چار سال میں ایک آدھ دفعہ انگلینڈ کا دورہ کر لیا کرتے تھے- یہ مہمان وہاں ان کے دوست تھے- ایک خاتون کا ذکر کر کے باجی کڑھا بھی کرتیں- لیکن ان کے لیے نت نئے کھانے پکتے، تحفوں کا تبادلہ ہوتا- حئی صاحب انگریز ٹائپ بندے ہیں- بڑے، نزاکت سے جینے کے عادی- بیرون ملک چند دنوں کے لیے وہ اپنی من پسند کمپنی میں رہ کر اپنا دل بہلایا کرتے تھے- دو ایک بار حئی صاحب نے کوشش کی کہ باجی ان کے ساتھ چلیں جبکہ باجی کہتیں میں تو جب بھی گئی حج پر جاؤں گی- خدا اور محمدؐ کی محبت

ان کے دل میں پرانی تھی۔ اس محبت پر انھوں نے اپنی شادی شدہ زندگی بڑی جاہلیت سے قربان کر دی۔ خدا سے اتنا ڈرنے والی باجی جانے اپنے شوہر سے کبھی ڈری کہ نہیں! اس کی خوشی کا خیال رکھا کہ نہیں۔

ہماری نانی یعنی بے جی ہی اصل میں باجی کی ماں تھیں۔ چھوٹے بڑے، ملا کر ہم گیارہ بہن بھائی ہیں۔ میرے والد میری امی سے شادی ہونے سے پہلے میری سب سے بڑی خالہ کے شوہر تھے۔ ان کے اس خالہ سے چار بچے ہوئے۔ آخری اولاد جڑواں بیٹی اور بیٹا تھے یہ بیٹی ہی باجی تھیں۔ جنھیں ان کی نانی، بے جی نے پرورش کی۔ نانی نے انھیں بڑے لاڈ اور پیار سے پالا لیکن اپنی من مانی کرنا، اکھڑ پن، اور انا پرستی جیسی خصوصیات بھی کوٹ کوٹ کر بھر دیں۔ بڑی خالہ کی وفات کے بعد ہماری امی جو سب سے چھوٹی بہن تھیں اور ابو سے 30 سال چھوٹی تھیں، قربانی کا بکرا بنیں۔ انھیں شادی کے تحفے میں خود سے دو چار برس چھوٹے بچے بھی ملے۔

باجی کو میں نے ابو سے شکایت کرتے کئی بار سنا تھا کہ ابا جی آپ نے میرے ساتھ زیادتی کی۔ پہلے خود سے الگ کر دیا۔ مجھے باقی سارے بچوں کی طرح تعلیم بھی نہیں دلوائی۔ پھر حیّ صاحب سے نہایت کم عمری میں بیاہ دیا۔ اس عمر میں بیاہی جانے والی باجی کو شوہر رکھنے کا سلیقہ آخری عمر تک نہ آیا۔ وہ شوقین مزاج، پڑھے لکھے، سوٹ بوٹ میں رہنے والے مرد تھے۔ انگریزی بولنے والی عورتوں کے شیدائی۔ باجی شکل وصورت، وضع قطع، لباس میں نہایت گریس فل ہونے کے باوجود ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنے کی صلاحیت سے یا تو محروم تھیں یا انھوں نے جان بوجھ کر خود کو مرد پر برتر ظاہر کرنے کے لیے کبھی کم ہی حالات سے سمجھوتہ کیا۔ مجھے یاد ہے بہت برس پہلے بھی کئی بار یہ معاملہ طلاق تک جا پہنچا کرتا تھا۔ لیکن ابو اور بھائی جان وغیرہ کبھی بندوق کے زور پر اور کبھی سمجھا بجھا کے معاملہ رفع دفع کروا دیا کرتے۔

دونوں بیٹیوں کے بیاہ کے بعد، ان بیٹیوں کے بڑے بڑے بچوں کے بعد بچوں کے نانا یعنی حیّ صاحب نے اسلام آباد میں ایک ادھیڑ عمر، نہایت پڑھی لکھی اور تہذیب یافتہ عورت سے شادی کر لی تھی۔ دراصل حیّ صاحب ریٹائرمنٹ کے بعد اسلام آباد پرائیویٹ نوکری کے سلسلے میں گئے تھے۔ وہ چونکہ لا ء بیرسٹر بھی تھے اس لیے کسی فرم نے

انھیں لیگل ایڈوائزر رکھ لیا تھا۔
سنا ہے انھوں نے کوشش کی تھی کہ باجی ان کے ساتھ اسلام آباد چلیں لیکن باجی نے حسب عادت انکار کر دیا کہ وہ اپنا گھر نہیں چھوڑیں گی۔ ان کا گزارہ نہیں ہے۔ یوں بھی باجی سدا سے حئی صاحب کی شوقین مزاجی کے تقاضے پورے کرنے سے بھاگتی تھیں۔
عین جوانی میں بھی وہ حئی صاحب کی رات کے وقت دی جانے والی آواز اور ڈیمانڈ پر تھوتھو کرتیں کہ یہ کیا بکواس ہے۔ شاید وہ بہت خشک مزاج عورت تھیں۔ ان میں نرم خواہشات کی کمی تھی وہ شوہر کے قریب جانے کو اپنے لیے مصیبت جانتی تھیں۔
دراصل ان کی جائز بات ماننا، بھی کسی حالت میں ان کے ذہن نے قبول نہیں کیا۔
مجھے اچھی طرح یاد ہے، شازی کے ساتھ چھٹیاں گزارنے اس کے گھر آئی تو میں اتنی چھوٹی بھی نہ تھی۔ رات کو باجی اور حئی صاحب کے بیڈ روم میں کھینچا تانی کی آوازیں خوب سمجھا کرتی تھی۔ حئی صاحب کے دوسری شادی کرتے ہی باجی مظلوم مشہور ہو گئیں بس وہ دن اور آج کا دن وہ اپنے گھر میں اکیلی رہ کر رہی تھیں۔
شازی شادی کے چند برس بعد ان کے اوپر کے پورشن میں شفٹ ہو گئی کیونکہ اس کے سسرال کے آبائی گھر میں اتنی ہی جگہ موجود تھی کہ ایک وقت میں ایک جوڑا وہاں رہتا۔ اگلی شادی تک پہلے جوڑے کو اپنے لیے دوسری جگہ کا بندوبست کرنا اُس چھوٹے گھر کی مجبوری تھا۔ سو وہ باجی کو اکیلا جان کر ان کے اوپر کے پورشن میں شفٹ تو ہو گئی لیکن شازی کے ساتھ باجی کے روابط نہ جانے کیوں نبھ نہ سکے۔ حئی صاحب سے تو چلو مانا۔ کچھ اختلافات تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے قطعاً مختلف تھے ایک دوسرے کے لئے بنے نا تھے۔ لیکن شازی کے ساتھ بھی سلسلہ کچھ خوشگوار ہو نہیں سکا۔ اور اس کے بچوں سے بھی باجی کے جھگڑے چلتے رہتے، شازی کے بیٹے طاہر نے بھی بیسیوں بار ب اجی سے ان کے کمرے سے نکل جانے کا حکم سنا تھا اور گالیاں تو معمول کی بات تھی۔ تنگ آ کر شازی اور ڈاکٹر اویس نے طاہر سے کہا کہ تم باجی کے سامنے مت جایا کرو۔ وہ تمھیں دیکھ کر غصہ کھاتی ہیں۔
اب تو طاہر باہر کے دیس پڑھنے چلا گیا ہے اور اس کی بہن صائمہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ماسٹرز کرنے چل دی ہے۔ 15 سالہ خبر جو شازی کی سب سے چھوٹی بیٹی ہے وہ بھی باجی کی نظروں میں اپنا مقام بنانے میں

ناکام رہی اور وہ بھی باجی کی نظروں سے گر گئی- سومی شادی کر کے سنت نگر کے چھوٹے سے گھر میں رہ رہی تھی- اس کے بھی تین بچے تھے-

باجی کی سومی سے دوستی شاید شازی سے دوستی نہ ہونے کا ردعمل تھی یا پھر یہ کہ سومی دور تھی، وہ باجی کی ہاں میں ہاں ملاتی تھی- سومی کی بھی شازی سے بہت گہری دوستی نہ تھی- شادی سے قبل بھی وہ شازی کی جاسوسی کیا کرتی اور خبریں باجی کو دیا کرتی تھی-

لیکن مزے کی بات ہے سومی کے بچے عزیز ہونے کے باوجود اتنی باجی سے اتنی مراعات نہ لے سکتے کہ باجی کے گھر میں کسی چیز کو اپنی مرضی سے ہلا جلا لیں- صوفے کے کور خراب ہونے پر ڈانٹ کے ساتھ ساتھ دھول تھپڑ بھی پڑ جایا کرتا- اسی لئے وہ بہت خوشی سے باجی کے گھر آنے پر رضامند نہ ہوتے تھے-

باجی کو انڈیپنڈنٹ زندگی کی ایسی عادت پڑی کہ وہ صاف کہہ دیتیں سومی اگلے مہینے آنا ترے بچے گھر میں شور کریں گے اور گند مچائیں گے-

وہ شازی کے مقابلے میں سومی کو نوازنا تو چاہتیں تھیں- شازی نے دراصل اوپر کے پورشن کو بڑے سلیقے انداز میں سجا کر کچھ نئی تعمیرات کے بعد ایک مکمل پورشن بنا لیا تھا جبکہ سومی سنت نگر کے پرانے، چھوٹے سے گھر میں تقریباً مشکل سے گزارا کر رہی تھی اور شفٹ نہیں کر سکے! سومی یوں بھی فطرتاً حاسد واقع ہوئی تھی اسے لگتا کہ شازی کے گھر میں اتنا کچھ ہے- پورا ڈرائنگ، ڈائننگ، بیڈ روم وغیرہ- میرے بچے ان تمام چیزوں سے محروم ہیں- پھڈا کروا کے اس نے حئی صاحب سے باقاعدہ اس گھر پر دونوں بہنوں کے نام کی مہریں تو لگوا لیں تھیں- اب وہ چاہتی تھی نیچے کے پورشن میں امی کے ساتھ شفٹ ہو کر قابض بھی ہو- لیکن باجی نے اسے اپنی زندگی میں ایسے موقع سے فائدہ اُٹھانے کا موقع نہ دیا- بلکہ حئی صاحب کی دوسری بیوی جب ایک موذی مرض سے چل بسی تو انھوں نے خواہش کی کہ وہ گھر واپس آ جائیں حالانکہ ان کی بیوی نے اسلام آباد میں نہایت خوبصورت اور فیشن ایبل گھر ترتیب دے رکھا تھا- بچہ پیدا کرنے کی اس عورت کی عمر نہ تھی جبکہ حئی صاحب 65 برس کے ہو کر بھی کسی صورت بوڑھے نہ لگتے تھے- اس کے مرنے کے بعد حئی صاحب اپنا سامان اُٹھا کر لاہور اپنے گھر آ گئے - شاید چند دن رہے بھی، لیکن حئی صاحب کو باجی نے ٹکنے نہ دیا کہ اس عمر میں شوہر کے چونچلے برداشت نہیں کر سکتیں- میں

اللہ اللہ کرتی ہوں- میں کھانے نہیں پکا سکتی- وہی حئی صاحب کا کھنچاؤ اور باجی کا تناؤ- بیٹیاں سمجھاتی رہ گئیں اور ایک بار پھر وہ اس گھر میں اکیلی رہ گئیں- اب کے حئی صاحب کو اپنی بیٹیوں کی عمر کی افغانی عورت نے پھنسالیا اور اس حسین و جمیل دوشیزہ نے ایک امیر، سمارٹ، ہینڈسم، بوڑھے شخص کو جوان کر کے ایک خوبصورت بیٹے کا باپ بھی بنادیا-

شازی کو ہم چھیڑا کرتے تھے کہ تیرے منے بھائی کا کیا حال ہے؟ باجی شازی کے اس لیے بھی زیادہ خلاف تھیں کہ شازی حئی صاحب کی سائیڈ لیتی تھی- وہ امی کے رویے کو غلط سمجھتی اور حئی صاحب کی شادی وغیرہ کو بھی اس نے بہت زیادہ مائنڈ نہیں کیا تھا- لیکن اس کے بچے نانا کو اکثر عیاش نانا کے نام سے یاد کرتے تھے اور شازی کے بچے بھی بھی اپنی امی کو اس کے چھوٹے بھائی کے ذکر سے چھیڑتے اور طعنے دیتے- سوی کو اکثر گلہ رہتا کہ نانا کی ساری مراعات خاص طور پر مالی مراعات شازی کے بچے جھپٹ لیتے ہیں-

حئی صاحب اب لاہور مہینوں کے بعد آتے اور ہمیشہ اوپر شازی کے پاس رہتے- دو تین دن سے زیادہ اب کبھی شاذ ہی رہے تھے- ہفتے کی رات کو آئے- اتوار کی رات کو چلے گئے- شازی ان کے لیے اچھے اچھے کھانے بناتی- وہ اس کے بچوں کو اکثر لبرٹی مارکیٹ سے کپڑوں وغیرہ کی شاپنگ کرواتے- بلکہ اکثر چیزیں بچوں کے منہ سے نکل ہی جاتا کہ نانا نے لے کر دی ہیں- تو سومی جل بھن جاتی- انھیں لاہور آنے کی ضرورت ہی کہاں تھی- ایک حسینہ کا پہلو چھوڑ کر آنا- ایک بہت ہی پیارے چھوٹے سے بچے سے دوری- اب ان کے بس میں تھا ہی کہاں؟ شازی بھی ابو سے ناراض رہنے لگی کہ ابو کو اب ہماری ذرا پرواہ نہیں رہی-

حئی صاحب کو سنت نگر جانا بہت پسند نہیں تھا کیونکہ وہ سائکل کے مارے ہوئے انسان ہیں- انھیں پرانے گھر کے پرانے آرکیٹکٹ سے الجھن ہوتی- سومی منتیں کرتی رہ جاتی- اکثر فون پر رو بھی پڑتی- باجی سے اب ضروری نہ تھا کہ حئی صاحب کی ہر بار ملاقات ہو- اپنی ساری اکڑ پھوں کے باوجود باجی کمزور ہوتی جارہی تھیں- اب ان میں وہ طمطراق موجود نہیں تھا لیکن باتوں میں وہی جھوٹی انا... جس میں خود کو بہت سکھی گروانے دیے جانا شامل تھا- لیکن کون نہیں جانتا تھا کہ ان کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے، اندر ہی اندر گھل کر وہ ختم ہو گئیں- آخری ایک دو سال میں ایک دو گھروں میں جاکر وہ دل کا بوجھ ہلکا

کرلیتیں- شاید انھیں کبھی اندازہ نہیں ہوسکا کہ زندگی کچھ لینے اور کچھ دینے کا نام ہے- شازی کے بچے بھی اب ان سے بہت دور ہو گئے تھے- بچے پیار کی زبان ہی سمجھتے ہیں- آج کے اس دور میں گالی کون سنتا ہے- اکثر کہتی میں نے ان سے کچھ مانگا ہے میرے یہ بچے بھی اپنے گھر میں خوش تھے وہ سوچتے ہمارے گھر میں سب کچھ ہے- ہمیں کیا ضرورت ہے گالیاں سنیں- کسی کی پرواہ کریں، بھلے نانی ہی کیوں نہ ہو-

لیکن اب باجی اپنے فیصلوں پر جلی اور نقلی طریقوں سے پردے ڈالتی ڈالتی تھک سی گئیں تھیں- لیکن ان کا نخرہ اور انا قائم تھی- اپنی کسی بھی غلطی کو انھوں نے آخری وقت تک تسلیم نہیں کیا- خدا کو دن کے ایک تہائی حصے تک بھی یاد کرلیا جائے تو باقی دن کے لمبے پینڈے اور پوری رات آخر وہ کیا کرتی ہوں گی- اوپر سیڑھی چڑھے انھیں برس گزر گئے تھے- سوئی دو تین ہفتے میں آتی- فون اکثر خراب رہتا- دولت الماریوں میں بند رکھ کر جانے انھیں کیا ملا- یا تو وہ خود پر کھلے دل سے خرچ کرلیتیں نوکر رکھتیں- فون، موبائل، اپنی سہولت اور آسانی پر صرف کرنا بھی شاید ان کے اصولوں میں نہیں تھا- اکیلے رہ کر کیا کھانا پکانا- سوئی کے آنے پر کھانا پکایا کرتیں- اب کھانا انہیں زیادہ ہضم بھی نہیں ہوتا تھا-

اندر اندر سے اس تنہائی اور قید تنہائی سے تنگ آچکی تھیں لیکن یہی کہتی تھیں میں نے اللہ سے یاری کر رکھی ہے- مجھے خواب میں جانے کیا کیا دکھائی دیتا ہے- خدا کا رستہ پاک رستہ ہے- وہ اپنے اصولوں پر زندہ رہنے کا ریکارڈ بنا کر گئیں- انھوں نے زیست کو اپنی بندی بنا کر جیا- جیسا جی چاہا وہی کیا لیکن آخر انسان تھیں چند برس سے اس گھٹ گھٹ کر جینے کے باعث چپ رہنے، اکیلے رہنے، اپنی بات کسی سے نہ کہہ سکنے کے باعث شدید ڈپریشن کا شکار ہوگئیں تھیں- سب نے سمجھا ان کا آخری وقت آگیا کیونکہ اتنی زیادہ کمزور ہوگئیں کہ بستر سے لگ گئیں تھیں- رنگ سیاہ پڑ گیا- ایک دو فیشن جو وہ ہمیشہ کرتی تھیں یعنی بال کالے کرنا، اور آئی برو پلک کرنا ان کو نبھانے کی بھی طاقت نہ رہی- لیکن اپنی قوت ارادی سے پھر اچھی بھلی ہوگئیں- صحن کے فرش پھر سے خود دھونے شروع کردیئے-

دراصل کام والیوں کو ویسے بھی اچھوت تصور کرتی تھیں- اور ان سے سخت الرجک تھیں- اب محلے کی کوئی کام والی ان کا کام پکڑنے کو تیار نہ ہوتی- خود ہی تھوڑا تھوڑا کر کے گھر کا کام کرتی رہتیں تھیں ایویں بھی

انھیں اپنی صحت پر بھروسہ تھا- اسی لیے اتنی بہادر تھیں- بہادری سے تمام عمر اکیلے گزار دی- معلوم نہیں انھیں رات کو خوف کیوں نہیں آتا تھا- گھر کے دروازے، کنڈیاں چڑھاتیں اور سو جاتیں- لیکن ہو نہیں سکتا تھا کہ رات کو اٹھنے والی وحشت کی آوازیں ان کے کانوں تک نہ پہنچتی ہوں-

میری آنکھوں میں اکثر اس زمانے کی باجی آتی ہیں جب وہ سومی شازی کے ساتھ ابو کے گھر آیا کرتی تھیں- نہایت شوخ رنگوں کے لباس، سونے میں لدی ہوئی- لال رنگ کی لپ اسٹک ان کا خاصا تھی- اونچی ہیل کی جوتی، پرس ہاتھ میں لٹکائے وہ ٹک ٹک کرتی آتیں- نہایت فریش اور حسین عورت کے روپ میں، ناک پر مکھی نہ بٹھانے والی عورت... ابو کے ساتھ بڑی خوش ہو ہو کر باتیں کیا کرتیں تھیں- ابو بھی انھیں خوب چھکے پر چڑھایا کرتے تھیان کی آمد پر، بہت پیار اور تپاک دکھاتے، خوب خاطر کرتے- انھیں لیڈی صاحبہ کہہ کر مخاطب کرتے- انھیں مشورے دیتے، وہ بھی ابا جی ابا جی کہہ کر خوب قصے سنایا کرتیں-

اب آخری عمر میں انھوں نے جو چند باتیں یاد رکھی، یا اکثر دھراتیں اس میں ابا جی کی چند نصیحتیں بھی وہ اکثر یاد کرتیں- کوئی انھیں اپنے گھر چلنے کو کہتا جیسا کہ وہ میری امی کے گھر جوان کی خالہ تھیں تو ان کے ابا جی کی چھوٹی بیوی تھیں لیکن بڑے بچے انھیں خالہ ہی کہتے- خالہ سے آخری عمر تک ان کی دوستی رہی- خالہ کے گھر آنا جانا انھوں نے کبھی نہیں چھوڑا- رکشہ میں بیٹھ کر سال میں دو تین بار ضرور آجایا کرتیں اور اگر انھیں سب کہتے کہ رات رہ جائیں تو کہتیں... خالہ میرے ابا جی کی نصیحت ہے، "ایمان ہے" انھوں نے کہا تھا کہ نصرت بیگم رات کسی کے گھر نہیں رہنا... رات اپنے گھر واپس چلے جانا... نہیں خالہ! میں رات کہیں نہیں رہ سکتی- اور واقع وہ حق صاحب کے چلے جانے کے بعد تمام عمر ایک رات کہیں نہیں رہیں- باجی کی بڑی بہن آپی کے بچوں کی شادی پچھلے برس ہوئیں- تو باجی نے بھرپور حصہ لیا- سٹیج پر ناچنے کی باری آئی تو باجی اپنی لگن اور مستی میں دیوانوں کی طرح ٹھمکے لگاتی چلی گئیں- مجبوراً ان کی حالت دیکھ کر سومی کو سٹیج پر آکر پہلے تو تھوڑی دیر ان کے ساتھ ناچنا پڑا پھر گھیر کر انھیں سٹیج سے نیچے لے جانا پڑا- کیونکہ ان کا دیوانہ وار ناچنا ان کو دیوانہ ظاہر کر رہا تھا-

مجھی باجی نے اپنی زندگی کی بے ترتیب

کتابچے پر جو لکھا انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا- وہ ایک معمہ عورت ہیں جن کی موت بھی ایک معمہ ہے- وہ آخری ملاقات میں امی کے گھر کہہ رہی تھیں، خالہ جب میں چلی جاؤں گی- تو سب پوچھتے رہ جائیں گے- آخر کیا ہوا- یہ اس کو ہوا کیا ہے؟

آج ان کی میت پر روتی ہوئی سومی، چنگھاڑتی ہوئی سومی، اور سسکیاں بھرتی ہوئی شازی دونوں کو تسلی ہے- باجی ان کے لیے اس مکان کے علاوہ 50 تولے سے زائد سونا، پانچ سات لاکھ روپیہ چھوڑ کر گئی ہیں- شازی کے رونے میں وہ شدت نہیں ہے جو سومی کے رونے میں ہے- آخری چند سال سے سومی ان کی تقریباً سیکرٹری بن گئی تھی اور یوں بانٹ سی ہو گئی تھی حئی صاحب شازی کے، اور سومی امی کی...!

حئی صاحب کو شازی نے صبح ہی روتے روتے فون کیا- ابو امی ہمیں چھوڑ گئیں ہیں- انھوں نے تسلی سے جواب دیا- میں اپنی گاڑی پر اس وقت پشاور کے راستے میں ہوں- میں پہلے پنڈی جاؤں گا، وہاں سے ڈائیو پر لاہور پہنچوں گا- دن کے دو تین بجے وہ رابطے میں رہے پھر اس کے بعد انھوں نے کسی کا فون نہ سنا پہلے جنازے کا اعلان وقت عصر طے ہوا- پھر حئی صاحب کے لیے مغرب تک بڑھا دیا- بیٹیاں کلپتی رہ گئی ابو آئیں گے- لیکن دونوں داماد سومی اور شازی کے شوہران حئی صاحب کے رویے سے کچھ اتنا خوش نہیں تھے اور باجی کے بھائی حئی صاحب کے سخت خلاف تھے، سب نے مغرب سے پہلے چارپائی اٹھالی- شازی امی کے ساتھ ابو ابو بھی کرتی رہی-

پھر پتہ چلا کہ شاید حئی صاحب پہنچ گئے ہیں- نماز جنازہ کے بعد اویس نے پھر حئی صاحب کو فون لگایا گیا، تو انھوں نے کہا وہ لاہور سے ایک گھنٹہ کے فاصلے پر ہی You go no! اور باجی نے حئی صاحب کو منہ دکھائے بغیر ہی زیر زمین جانا پسند کیا-

قل کے دن میں نے حئی صاحب کو گھیر لیا اور بہت سی باتوں کے بعد انھیں کہا کہ کیا آپ جانتے ہیں آپ کو سب اس موت کا ذمہ دار مانتے ہیں- اس دم وہ قل خوانی کے فوراً بعد اسلام آباد روانگی کے لیے گاڑی میں بیٹھ رہے تھے- بولے ہر شخص اپنے قول و فعل کا خود ذمے دار ہے! پہلی جمعرات پر شازی کے بقول حئی صاحب فون پر کہہ رہے تھے، تمھاری ماں مجھے چاروں طرف کھڑی ہو کر گھورتی رہتی ہے!

☆☆☆☆☆

چھٹی انگلی

بہار جب کلیاں چٹخاتی ہو اور گلوں کے شگوفے پھوٹ پڑتے ہوں، مشرق کے دامن سے صبح دم آفتاب کی صاف وشفاف پہلی روکرنیں کوہساروں کی چوٹیوں پر پھسلتے ہوئے آنکھوں کو خیرہ کردیتی ہوں اور یہی آفتاب جب شام کے پھیلتے سایوں سے قبل زعفرانی مغرب کی گود میں سہج سہج اُترتے ہوئے تاحدِ نظر شفق پر ایسی سرخی پھیلادے جونئی نویلی دُلہن کے ہونٹوں پر جم کر گلاب کی نازک پنکھڑیوں کا پتا دیتی ہو۔ موجِ صبا کی روانی چمن کے ہر گوشے میں ہو اور جس کی بدولت ہر رنگ اور ہر قسم کے پھولوں کی مہک فضا کے جسم میں رچی بسی ہو اور جس سے دلوں میں خوشیوں کے شادیانے بج اُٹھتے ہوں۔ دل کی ہر دھک دھک کے ساتھ شادمانی کے نئے جلترنگ اور نئے نئے ساز بج اُٹھتے ہوں تب مسرتوں سے لبریز گیتوں کی پھوار شبنم کے موتیوں کی طرح صاف و شفاف اور انتہائی معصوم معلوم ہوتی ہے۔ جسم کے ہر مسام پر گلِ رعنا کی مہک ریشمی پردوں کی طرح رکھی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور ہر طرف راحت و الفت کے سامان بکھرے دکھائی دیتے ہیں اور شباب و شاداب سے غٹا غٹ بھرے قصے گونجتے سنائی دیتے ہیں۔ ایسے میں کسی دل کا پریشان ہونا اور اس میں رنج وغم اور حسرت ویاس کے بادلوں کی لپٹوں کا تیرتے رہنا یقیناً کسی بہت ہی گہرے صدمے، کسی گہری چوٹ یا کسی بہت ہی عمیق دکھ و درد کا نتیجہ ہوتا ہے۔ درد کہ جو اپنی گہرائی کے ساتھ نشتر کے ایسے ہزار زاویوں کے ساتھ نازک وجود پر حملہ آور ہوتا ہے اور پھر دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ کون ہے جو اس اَن دیکھے نشتر کو جسم سے نکال پھینکے اور کون ہے جو اس درد کے مداوا کا روپ دھار سکے قبل اس کے کہ یہ روح کو بھی گھائل کردے!!!

باغوں میں طیور کی چہک اور گلوں کی مہک ہر نفس کے لیے فرحت ومسرت کا سامان بہم مہیا کیے ہوئے تھی اور آسمان پر تیرتے سفید

انعام الحسن کاشمیری

بادلوں کے غول حیرت واستعجاب کے نئے در وا کرنے میں مصروف تھے۔ ہر شخص موسم کی دلفریبی، خوش مذاقی اور لطف اندوزی میں مستغرق تھا اور کوئی دل ایسا نہیں تھا جس کے آس پاس بھی کہیں کوئی حسرت، کوئی کسک یا کوئی کرب دکھائی دیتا لیکن ان سب کے باوجود ایک دل بے حد رنجیدہ اور کبیدہ تھا۔ اس کی غمگینی کے سامنے طیور کی چہک اور ان کی خوش الحانی کا کوئی مقام نہ تھا اور اس کی افسردگی کے آگے گلوں کی مہک اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر ناچتی آفتاب کی زرد رو کرنوں کی کوئی لطافت نہ تھی۔

اداسیوں نے اُس کے دل میں بری طرح گھر کر لیا تھا اور اُس کی پژمردگی اور شکستگی ہر گزرتے دن کے ساتھ اور زیادہ گہری اور دوہری ہوتی جاتی تھی۔

اُس کا دل بے حد مغموم تھا اور اُس کی آنکھوں میں ویرانیوں اور اداسیوں کے ڈیرے تھے۔ اُس کی نظروں میں ہر چیز بے وقعت ہو کر رہ گئی تھی اور اس کی زندگی میں اس وقت رنگینی، دلفریبی کا کوئی عنصر دستیاب نہ تھا۔ اس کے مکاں و لامکاں میں آزردگی کے کالے کالے سائے پھیلے ہوئے تھے اور ایسا معلوم پڑتا تھا کہ اس کے جنم سے پہلے کسی نحوست نے اس کی خوشیوں بھری زندگی کے در پر بھاری قفل چڑھا دیا تھا جسے کھولنے کی کوشش میں اس کے ہاتھ زخمی ہو جائیں گے اور اس کی لانبی انگلیاں اپنی تمام تر رعنائی کے باوصف لہولہان ہو کر رہ جائیں گی۔

بالکونی میں کھڑے کھڑے کافی وقت بیت گیا۔ سامنے سرسبز و شاداب پہاڑوں کی چوٹیوں پر آفتاب کا سرخ بدن آگ کے بہت بڑے گولے کی مانند دکھائی دینے لگا۔ بالکونی سے کچھ پرے درختوں کے جھنڈ میں پرندوں کے شور و غل کی آوازیں شام کے پردے گرنے کا پتا دے رہی تھیں۔ اُس نے ریلنگ پر جمے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے، انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور پھر اپنے آپ سے کہنے لگا: ''کاش! کاش! کاش ایسا نہ ہوتا!۔۔ کیا تھا جو قدرت کی بے انتہا فیاضیوں کے ساتھ یہ نحوست نہ چلی آتی۔ کیا تھا جو رحمتوں کی بارش میں یہ اولے برس نہ پڑتے اور امید کا کوئی پیڑ ٹنڈ منڈ نہ ہونے پاتا اور کوئی کلی کھلنے سے پہلے ہی نہ مرجھا جاتی۔۔ آہ!'' اُس نے دونوں ہاتھ اپنی کمر کی پشت پر باندھے اور پھر اپنے عالیشان کمرے میں آ گیا۔

اُس کی تکلیف، آزردگی اور کبیدگی کا باعث وہ دو انگلیاں تھیں جو اُس کے دونوں ہاتھوں میں اضافی طور پر موجود تھیں۔ اس کے ہر ہاتھ میں چھ چھ انگلیاں تھیں۔ یہ اضافی

انگلیاں اُسے اپنے ہاتھوں کا بہت بڑا عیب محسوس ہوتیں۔ اُسے لگتا کہ یہ مخمل کے قالین میں ٹاٹ کا پیوند ہے جس نے حسن و رنگینی اور ملائمت و راحت کے چاند کو گہنا دیا ہے اور جس نے چمکتے دمکتے سورج کے سامنے شبِ اماوس کے تاریک تر سائے لہرا دیئے ہیں۔ اب اُس کا ارادہ تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے، ان عیبوں سے اپنی خلاصی کروالے۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو ان نقائص سے پاک کر کے اپنی خوبصورتی اور اپنی انگلیوں کے مخروطی پن سے دوسروں کو مخمور کر دے۔ وہ ایک انتہائی خوبصورت، وجیہ، دراز قد اور زبردست شخصیت کا حامل باوقار مرد تھا۔ وہ اگرچہ عورت نہیں تھا لیکن اس کا حسن و جمال کسی مہ جبین کے مانند تھا جس پر چاندنی منعکس ہو کر تاریکی کے دبیز پردوں کو چاک کر دیتی ہو۔ اُس کی آنکھیں نیلگوں سمندر کا ایک بڑا قطرہ تھیں اور اس کی ناک بالکل ستواں، اس کے بال بھورے تھے اور اس کے جسم کے تمام روئیں بھی ایسے ہی رنگ کا آمیزہ۔ اُس کے ہاتھ بے حد نازک تھے اور اس کی لانبی مخروطی انگلیوں میں ایک عجیب طرح کا سحر پوشیدہ تھا۔ کسی محفل میں جب کبھی وہ اپنا ہاتھ لہراتا، تو لوگوں کی نگاہیں ان پر جم جاتیں اور گلے پھاڑ پھاڑ کر چیخنے والے لوگ دم بھر میں خاموش ہو جاتے۔ لیکن اب کچھ عرصے سے اُسے شدت سے اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ لوگ اس کی امارت سے مرعوب ہو کر اُس کے سامنے اونچا بولنے سے گریز کرتے ہیں اور جب وہ کسی کو خاموش ہونے کا کہتا ہے تو مخاطب محض اس امارت کے لحاظ میں ادب کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے وگرنہ حقیقت یہ ہے کہ لوگ دل ہی دل میں اُس پر ہنستے ہیں۔ وہ اپنی نجی محفلوں میں اُس کے عیبوں پر دانت نکالتے ہیں اور اُس کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ وہ ہنس ہنس کر ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ دیکھو! اگر آپ کے چہرے پر ایک اور ناک ہوتی یا آپ کے بتیس دانتوں میں ایک اور دانت اگ آئے تو کتنا برا اور بدنما لگے۔ دیکھیے! اگر آپ کے دم ہوتی تو کس قدر مضحکہ خیز صورت حال برپا ہو جاتی۔ اب یہی اصغر آفندی کے ہاتھ دیکھ لیجیے! کس قدر خوبصورت اور بھلے معلوم ہوتے ہیں جب تک کہ وہ ان کی نمائش نہ کرے۔ اضافی دو انگلیوں کے باعث اس کے ہاتھ کسی عفریت، آسیب کے مانند دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے اُس کے ہاتھ پر کسی بھوت کا ننھا سا بچہ چمٹا بیٹھا ہے جو ہر لمحہ ہم پر اپنی خونیں نگاہیں گاڑے ہم میں سے کسی ایک فرد کا خون ہر روز چوسنے کے

در پے ہو۔

یہ سب اور اس طرح کی بہت سی اذیت ناک باتیں سوچ سوچ کر وہ بے حد ہلکان ہو جاتا۔ اس کا نازک وجود ہلکورے کھانے لگتا اور اس کی کنپٹیاں سلگنے لگتیں۔ احتیاط کے طور پر اس نے ایک روز فیصلہ کیا کہ اب کسی محفل میں، کسی کے سامنے اپنے ہاتھ نہیں لہرائے گا۔ پھر اس نے ایک روز اپنے دونوں ہاتھوں پر بے حد نفیس دستانے چڑھا دیئے لیکن کچھ ہی عرصے بعد اسے احساس ہوا کہ ایسا کرنے سے وہ اجنبی لوگوں کو بھی اپنے ہاتھوں کی جانب متوجہ کر رہا ہے۔ یہ لوگ اندازہ لگاتے ہیں کہ اُس کے ہاتھ خارش زدہ ہیں یا کوڑھ کے مرض کا شکار اور جب ایک شخص نے نہایت مؤدبانہ اور ہمدردانہ انداز میں اُس سے کہا کہ جناب! اگر آپ ہاتھوں کے کسی پُراسرار مرض میں مبتلا ہیں، تو چنداں فکر نہ کیجیے، میں ایک نہایت قابل حکیم کے مطب کا پتا جانتا ہوں، آپ کو وہاں سے کامل شفا مل جائے گی۔ یہ سنتے ہی وہ بھنا کر رہ گیا۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور اس کا دل شدت سے چاہنے لگا کہ وہ اس شخص کے منہ پر ایک زوردار گھونسا جما دے چنانچہ اس نے اِس لباسِ دست کو خیرباد کہہ ڈالا۔

شاید وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ کڑوی کسیلی اور دل کو رنجور کر دینے والی باتوں کا عادی ہو کر ان کی کڑواہٹ اور ان کی نمکینی کو فراموش کر ڈالتا لیکن ایک روز اُسے اس امر کا نہایت شدت سے احساس ہوا کہ اِس عیب نے اُس کی زندگی کو اجیرن بنا ڈالا ہے جو کہ کسی صورت نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس عیب نے درحقیقت اس کے لیے اصل خوشی و راحت کے دروازوں پر زنگ آلود قفل چڑھا دیئے ہیں اور اس کے لیے راحتوں سے لبریز محلات میں کھنڈرات اور ویرانیوں کے آسیب زدہ قلعے تعمیر کر دیئے ہیں۔ اُس روز وہ اپنی معمول کی سیر و تفریح کے لیے گھر کے قریب ہی ایک باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ موسم بے حد خوشگوار تھا اور نیلگوں آسمان پر بادلوں کے سفید رتھ تیرتے ہوئے نہایت بھلے معلوم پڑتے تھے۔ وہ ایک روش پر محوِ خرام تھا جب اُسے نسوانی قہقہے سنائی دیئے۔ آن کی آن میں دوسرو قد مہ جبیں اس کے روبرو کھڑی تھیں۔ ایک کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی اُسے محسوس ہوا کہ جیسے برسوں کی تشنگی سیراب ہونے کے قریب ہے اور بے آب و گیاہ ریگستان میں پھرتے پھرتے اچانک نخلستان نمودار ہو گیا ہے۔ اِس پہلی ملاقات میں گو کہ اس کی وارفتگی اور اس کی گرمجوشی اپنی انتہاؤں پر تھی لیکن جب اُس نے دیکھا کہ جس مہ جبیں کو وہ اپنے

دل کی ملکہ بنا چکا ہے، اُس کی نظریں مسلسل اُس کے ہاتھوں کا طواف کر رہی ہیں تب اس کے دل کو سخت ٹھیس پہنچی، اُسے محسوس ہوا کہ کہیں بہت قریب سے شاید اُس کے اپنے وجود کے اندر سے کسی نہایت نازک آبگینے کے ٹوٹنے کی آواز بلند ہوئی ہے۔ اُس نے اپنے ہاتھ پشت پر ٹکائے اور اگلی شام ملاقات کا پیام دے کر روانہ ہو گیا۔

رات بھر وہ اس خیال میں غلطاں رہا کہ کیا اُس کی ہر ہاتھ کی چھٹی انگلی اس کے دل کی مراد بر آنے میں کوئی رکاوٹ تو نہ ڈالے گی اور کیا وہ مہ جبیں اسے بھی اپنے دل کے کسی گوشہ میں جگہ دے چکی ہے؟ سحر کے آثار نمودار ہونے تک وہ یہی سوچتا رہا اور جب صبح نمودار ہوئی تو اُس کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں اور اُس کے وجود میں کسل مندی کے آثار نمایاں تھے کیونکہ وہ ساری رات امید اور یقین کے درمیان سفر کرتا رہا تھا جس نے اُسے بے حد تھکا ڈالا تھا۔

اگلی شام اگرچہ وہ باغ میں موجود تھا لیکن اس کا دل امید و بیم کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ یہ بھی عجب تماشا ہوا کہ اس کے انتظار کا سفینہ وصل کے ساحل سے جا ہم کنار ہوا اور اس کے دل میں بہار رُت کی آفرینیاں اٹھکیلیاں کرنے لگی لیکن جب وہ رخصت ہوا تو اُسے یقین ہو گیا کہ اس ایک عیب نے اس کی ہر خوشی کے آگے بند باندھ دیے ہیں اور اس کی راحت کی ہر راہ میں پھاٹک لگا دیے ہیں اور شادمانی کی ہر روش لخت لخت ہو گئی ہے۔ آج کی رات بھی نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور رہی۔ گزشتہ رات وہ امید و یقین کے درمیان سفر پر محوِ خرام تھا لیکن اس کے باوجود اس کے قدم بار بار یقین کے دائرے میں جا نکلتے تھے جہاں اس کی محبت محوِ رقص تھی اور جہاں وہ مہ جبیں اس کے ہاتھ تھامے رقص کناں! لیکن آج کی رات ایسا کوئی دائرہ نہیں تھا جہاں یہ محبت رقصاں ہوتی اور جہاں کوئی دلربا اُس کے ہاتھ تھامے حسین نظاروں کے دیدار میں غلطاں ہوتی۔۔۔ آخر جب سپیدہ نمودار ہوا تو اُس نے سختی سے یہ ارادہ کر لیا کہ وہ صبح ہوتے ہی شہر کے سب سے بڑے ہسپتال کا رخ کرے گا اور اپنی اضافی انگلیوں کو کٹوا کر ہاتھوں کو ان کے عیوب سے پاک کروا لے گا۔ چنانچہ صبح ہوتے ہی وہ ہسپتال کی جانب روانہ ہو گیا۔ ہسپتال کے کئی ڈاکٹر اس کے دوست تھے اور جب اُس نے اپنے سب سے قریبی دوست کو جس سے وہ اپنے دل کی ہر بات کہہ ڈالتا تھا، اپنی اس پریشانی سے آگاہ کیا تو یہ سن کر وہ ہنس پڑا۔ ہنستے ہوئے اُس نے اپنے سر کو کرسی کی پشت پر ٹکا دیا اور پھر کرسی کو

جھولاتے ہوئے کہنے لگا: ''تم عجب پاگل شخص ہو، کوئی تمھیں کچھ نہیں کہتا، بس تم خود سے اندازہ لگاتے ہوئے خود کو پریشان کرتے رہتے ہو کہ لوگ تمھارے ہاتھوں کے عیب کی وجہ سے تمھارا تمسخر اڑاتے ہیں اور تم سے نفرت کرتے ہیں۔''

''نہیں نہیں--- یقین جانو میرے ہاتھوں کا یہ عیب، یہ اضافی انگلیاں میرے لیے کبیدگی اور رنجیدگی کا باعث ہیں۔ ان کی وجہ سے میں کئی محفلوں میں بے حد اذیت اٹھا چکا ہوں اور اب تو اس کی انتہا ہو چکی ہے۔ کیا میں ان کی وجہ سے اپنی وہ محبت گنوا دوں جو مجھے کل ہی حاصل ہوئی ہے؟'' اُس کی آواز میں بڑا درد پنہاں تھا اور صاف معلوم پڑتا تھا کہ وہ رونے کے قریب ہے۔

''لیکن محبت تو تمام تر عیوب کے ساتھ قبول کیے جانے کا نام ہے۔ یہ کیسی محبت ہوئی جو محاسن کا طواف تو کرتی ہو لیکن قباحتوں سے دور بھاگتی ہو۔''

''ہاں ہاں، ایسا ہی کچھ ہے۔ بس تم میرے دکھ اور درد کو اور زیادہ بڑھاوا نہ دو اور فوری آپریشن کا وقت تجویز کر کے مجھے اس رنج اور کوفت سے نجات دلاؤ۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ تم جیسا کہتے ہو، ویسا ہی سہی لیکن میرا مشورہ مانو کہ ابھی تم اس معاملے پر کچھ دن مزید غور و فکر کر لو، کچھ چیزیں انسان کو اپنی ذات اور اپنی زندگی میں بہت بری اور نقص زدہ معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں وہ خوش بختی اور خوش قسمتی کا باعث ہوتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ اضافی انگلیاں جو اگرچہ دیکھنے میں ہاتھوں کے لیے عیب زدہ معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں تمھاری ساری خوش بختی اور تمھارے سارے نصیب اس کی بدولت ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اِدھر تم ان سے چھٹکارا پاؤ اور اپنے وجود کو ان کے عیب سے پاک کرو، اُدھر تمھاری بدنصیبی تم پر اپنا منحوس سایہ ڈال دے اور تب تمھارے پاس مداوے کی کوئی صورت باقی نہ رہے اور صرف پچھتاوا ہی باقی بچے۔''

اپنے عزیز دوست کے بہتیرے سمجھانے کے باوجود اس کی عقل پر محبت کے دبیز پردے لہراتے رہے اور اس کے دل میں عشق کے سوز کی لہریں ہچکولے کھاتی رہیں۔ ہر شخص جس نے بھی سنا کہ اصغر آفندی کے ہاتھ کا تین دن کے بعد آپریشن ہوگا، اس کے لیے دعا کرنے لگا کہ وہ ایسا کرنے سے باز رہے۔ وہ جو سمجھ دار تھے اور جنھیں وہ اپنے بزرگوں کا درجہ دیتا تھا، وہ بھی اُسے سمجھانے میں ناکام رہے اور خوامخواہ کی الجھن اور مصیبت کو اپنے گلے نہ ڈالے۔ انھوں نے اُس سے یہ بھی کہا کہ کوئی شخص اُس کے

بارے میں برا نہیں سوچتا اور نہ ایسا کہتا ہے، یہ سب چیزیں اُس کے اپنے ذہن کی اختراع ہیں اور اُسے ان اختراع شدہ چیزوں کے بوجھ تلے دب کر اپنا وجود مسخ کرنے کی کوشش سے دور رہنا چاہیے لیکن وہ ہیولا جو اس کے آس پاس منڈلا رہا تھا اور جس کی بنفشی شعاعیں اس کے جسم کے آر پار کھب رہی تھیں ان کی بدولت اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں، اور اس کے حواس پژمردہ ہو کر رہ گئے تھے۔ جذب و عقیدت کی جس کیفیت میں وہ مبتلا ہو گیا تھا اب اس سے تلافی ممکن نہ تھی۔ آخر ایک دن جب اس کے ہاتھوں پر سے سفید پٹیاں اُتریں تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھل اٹھی۔ ایسا لگا جیسے کسی ویرانے میں برسوں بعد بہار اُترتی ہے جس نے مردہ شاخوں پر شگوفے بکھیر دیے ہیں اور درختوں کی ٹہنیوں پر سبز پتے نکل آئے ہیں۔ اور جب وہ باغ میں گیا تو اُسے ہر چیز بے حد حسین لگی۔ باغ کی ہر روش اور ان کے کنارے کیاریوں میں لگے پھول اُسے پہلے سے کہیں زیادہ شگفتہ دکھائی دیے اور جب اُس پری وش نے اس کے ہاتھوں کو دیکھنے کے بعد پہلے سے کہیں زیادہ خوش الحانی، خوش ذوقی اور اپنائیت کے ساتھ اُس سے محبت بھری گفتگو کی تو وہ بے حد مسرور ہوا۔ آج کے دن اُسے خوشی کی نئی تعبیر سے آشنائی ہوئی اور اُسے معلوم ہوا کہ زندگی میں لطافت اور راحت کس طرح لائی جا سکتی ہے۔

بہت دن بیت گئے۔ الفت و محبت کے بے نیام اسپ کے قدم کہیں پر بھی تک نہیں رہے تھے۔ دامنِ بشر خوشیوں و مسرتوں کے گلوں سے کم پڑ گیا تھا اور دل کے نہاں خانوں میں ہر دم و ہر پل راحت و شادمانی کے نغمے گونجتے رہتے تھے لیکن یہ سب ایک دن کایا کلپ کی بھینٹ چڑھ گیا اور اصغر آفندی کی زندگی کے نصف النہار پر شبِ اماوس کے تاریک پردے چھا گئے۔ کاروبار میں مسلسل گھاٹا رہنے کے بعد ایک دن اُس نے قرض خواہوں کے مطالبات سے چھٹکارا پانے کے لیے اپنے عالی شان محل کو فروخت کر ڈالا۔ اِس رقم میں سے ہی اُس نے شہر کے مضافات میں ایک معمولی قسم کا مکان خرید لیا تاکہ رہائش کا کچھ انتظام ہو سکے۔ اب وہ اس شدت کے ساتھ بھاگ دوڑ کرنے لگا تاکہ اپنے زوال پذیر کاروبار کے حسنِ انتظام میں کچھ بہتری لا سکے لیکن ہر نئے طلوع ہوتے آفتاب کے ساتھ اس کی پروان چڑھتی امید غروب ہوتے آفتاب کے ساتھ ہی حسرت و یاس کے گہرے سمندر میں ڈوب جاتی۔ لوگ اب اُسے فاتر اور مخبوط الحواس قرار دینے

گئے۔ کچھ ہی دن اور گزرے تھے کہ اُسے اِس محبت نے بھی ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا جس کے لیے اُس نے اپنے بختوں اور اپنے نصیبوں کے کھلے دروں پر کواڑ بھیڑ کر بھاری قفل چڑھا دیے تھے۔ اور اب جب یہ زنگ آلود قفل کھولنے کی جتنی تدبیریں کرتا، اس کے ہاتھ اتنے ہی لہولہان ہو جاتے اور اس کا دل ان سے کہیں زیادہ زخمی اور اس کی روح اس سے بھی زیادہ گھائل ہو جاتی۔

لوگ دیکھنے لگے کہ وہ شخص جس کی خوش لباسی، خوش ذوقی، جس کی شاندار محفلوں اور جس کی دل آویز گفتگو کے چرچے شہر بھر میں تھے، اب اِسی شہر کی سڑکوں پر دیوانہ وار گھومتا پھرتا ہے۔ اس بھرے شہر میں جہاں ہر صاحبِ ثروت اس کے حلقہ یاراں میں شامل تھا، ایک بھی شخص ایسا نہ تھا جو اس کی دلجوئی کرتا اور اس کے بخت جگانے کا کوئی سامان مہیا کرتا۔ سب نے اس سے منہ پھیر لیے تھے اور اُسے بری طرح دھتکار دیا تھا۔

اب وہ اپنے اچھے وقت کو یاد کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو زور زور سے جھٹکنے لگتا جیسے وہ اِن پر جمی ہوئی کوئی چیز دور پھینکنے کی کوشش کر رہا ہے یا پھر ہاتھوں کے اندر سے کوئی چیز باہر نکالنے کی تگ و دو میں ہے۔

آخر کار ایک دن لوگ بھول گئے کہ اس شہر میں کبھی ایک ایسا صاحبِ ثروت بھی تھا جس نے اپنے ہاتھوں اپنی نیک بختی کا گلا گھونٹ ڈالا اور جس نے اپنے ہاتھوں اپنے لیے ظلم و جبر اور غم و یاس کی گہری قبر کھودی۔ لوگ اپنے اپنے مشغلۂ حیات میں مصروف رہے اور روز افزوں ان کی یادداشت پر نت نئی باتوں اور مصروفیات کی موٹی موٹی گرد جمنے لگی لیکن ان میں ایک مفلوک الحال شخص ایسا بھی تھا جسے سب کچھ یاد تھا۔ وہ راہ چلتے ہر شخص کا دامن پکڑ کر اُس سے اپنی داستان بیان کرنے کی کوشش کرتا کہ کوئی اس سے عبرت حاصل کرے لیکن لوگ اپنا دامن چھڑا کر بھاگ جاتے۔ اُن کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ وہ اُس کی غم انگیز داستان سن کر اپنے دلوں کو اُس کے رنج و الم سے ملول کرتے۔

وہ صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ انسان کی عقل ناقص ہے اور وہ ہرگز نہیں جان سکتا کہ خوبصورتی، دلکشی اور رعنائی کا اصل پہلو کون سا ہے اور یہ کہ کس عیب کے پردے میں انسان کی کون سی خوش بختی پوشیدہ ہے — وہ چیخ چیخ کر یہ سب کہتا اور پھر خاموش ہو جاتا۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے سارے شہر نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس رکھی ہیں، جس طرح کہ ایک دن اُس نے بھی اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس دی تھیں۔

☆☆☆☆☆

ہمیں کیا پتا

یہ 'موسیقی' ساری ہے
'توسیعِ مکروہ' کے بعد کی
خامشی سے ابھرتی ہوئی
بے توازن دُھنوں پر
تکبّر کی ماری انا زاد اشرافیہ کو
جو ترتیب دینی پڑی ہے
علاقائی مجبوریوں میں
اِسے دیکھ مت
اپنے نادید سپنوں کی
نزدیکیوں، دُوریوں میں
گمانوں کے گہرے فسوں سے نکل!
رہ نہ اب اور
دانش کی مغروریوں میں
بدلتے ہوئے عالمی کھیل کے
رنگ پر کر نظر
جانچ اُس روک اور کھینچ کو
جس کے بَل سے نہیں ہے
کسی کو مفر
روشنی کا سفر بھی ہے جاری
اِنہیں نا گہانی
وقوعوں کے جنگل کی
بے نوریوں میں
رسائی ہو کیسے مگر
آخری فیصلے تک
شب و روز چاروں دِشاؤں سے
یلغارتی بے یقینی کی
مقہوریوں میں
ہمیں کیا پتا
نیم آگاہ سوچوں کی
معذوریوں میں
کہ ہونا ہے کیا
اور ہونا نہیں کیا
مشیّت کی
تہہ دار منظوریوں میں

جلیل عالی

امر کہانی

میں نے جس حال میں اسے دیکھا
اس کی آنکھوں میں نیم خوابی تھی

اس کا چہرہ سکوں سے عاری تھا
داستاں میں نے جب سُنی اس کی

مجھ کو محسوس یوں ہوا جیسے
یہ کہانی امر کہانی ہے .....

جس میں کردار سارے مُشترکہ
درد اور بار سارے مُشترکہ

گفتگو ان کی بے زبانی ہے
زُود رنج ان کی زندگانی ہے

میرا مہماں تھا یا مرا ہمزاد
سوچ میں مُبتلا ہوں میں اب تک
اب وہی میں ہوں اور اُس کا خیال

سید افسر ساجد

عید

تمہارے بعد

ہر احساس کے معنی

بدلتے جا رہے ہیں

دھوپ اب آتش ہے

سایہ برف ہے

تازہ ہوا محبوس ہے

عہدِ بہار آزار ہے

شب قبر کی تنہائی ہے

امروز پیہم روگ ہے

اور عید کا دن ہے

کہ یومِ سوگ ہے

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خاک پر خاک کی ڈھیریاں رہ گئیں
آدمی اُٹھ گئے ، نیکیاں رہ گئیں

کوئی آئے برس یہ کہتا ہے

کوئی آئے برس یہ کہتا ہے
وہ خواب مجھے واپس کر دو
جو نصف صدی سے بے تعبیری کے بے نام
سفر میں ہیں
وہ آنکھیں،
وہ تم مانگ کے لائے تھے اپنے چہرے کے لیے
کب دو گے؟
جب وہ پتھر کی ہو جائیں گی!

وہ جذبے،
جو سینوں کو مشعل رکھتے تھے
تم جانے کون سے برف سے ڈھکے
پہاڑوں میں چھوڑ آئے ہو

وہ بازو،
دنیا، جن میں سمٹ آیا کرتی تھی
میں نے تمھیں دے ڈالے تھے
اب کہاں ہیں وہ؟

وہ خون آلود قبا میری،
تم پہن کے جس کو نکلے تھے
ایثار و عمل کے رستے پر
لوٹا بھی دو!
کہ اس سے پھوٹتی میرے لہو کی خوشبو پر
برسوں کے پسینے اور تعفن کا قبضہ ہے

وہ آئے برس یہ کہتا ہے
میں آئے برس یہ سوچتا ہوں
اب کہاں سے لاؤں اس کی وہ آنکھیں
وہ خواب،
وہ جذبے،
وہ بازو،
وہ خون آلود قبا
کہ میں خود بھی تو اس طرح
بے چہرہ ہوں،
بے بدن ہوں اب

محمد انیس انصاری

سُن اے خواب نگری

مجھے یہ پتا ہے
ترے میٹھے موسم
بدلتی ہوئی رت کی کڑواہٹوں میں گھلے جا رہے ہیں
وہ بیٹھک
وہ چھت گیر پنکھے کی گھر گھر میں سوئی ہوئی ٹھنڈی بیٹھک
وہاں اب
چمکتے ہوئے دودھیا قمقموں کی سلگتی ہوئی روشنی جاگتی ہے
یہاں ایک آنگن تھا
جس کے بڑے طاق میں گرسلیں تنکا تنکا اٹھا کر
بناتی تھیں گھر اور چہکتی تھیں
جیسے انہیں بارشوں اور ہواؤں کی یلغار کا
کوئی خدشہ نہ ڈر ہو
جنم دینے والی نے مجھ کو
یہاں اپنی باہوں کا جھولا جھلایا
پرندوں کے مانند جینا سکھایا
یہیں ایک دہلیز بھی تھی
مری کم سنی کے قدم سے زیادہ تھی اونچی
یہاں ننھی سی لڑکھڑاہٹ کی ٹھوکر تھی
چوٹیں تھیں
اور آسماں جیسی چادر کی بُنّی
وہ دالان، جس میں مرے باپ دادا نے
سانسیں بھری تھیں
کوئی بے سُرا شور و غل اس کی خاموشیاں کھا گیا ہے
نظر آ رہا ہے
یہاں سکڑے سکڑے مکانوں کی
توندیں نکل آئی ہیں
صاف دل فخر و نخوت کے کیچڑ میں
لتھڑے ہوئے ہیں
سُن اے خواب نگری
میں تیرے بدلتے زمانے کا باسی نہیں ہوں
مگر جب!
تری گلیوں، کوچوں، محلّوں میں آؤں
مجھے خوش دلی سے ملا کر

طالب انصاری

اے یوسفِ گم گشتہ

کیا علم کہاں ہے تو اے یوسفِ گم گشتہ
ہو شاد جہاں ہے تو اے یوسفِ گم گشتہ

سکھ میں ہے کہ دُکھ میں ہے معلوم نہیں ہم کو
مدت سے نہاں ہے تو اے یوسفِ گم گشتہ

مشکل ہے بہت مشکل جینا تری دوری میں
سرمایۂ جاں ہے تو اے یوسفِ گم گشتہ

ہر چند ہوا غائب یعقوب کی نظروں سے
پر دل پہ عیاں ہے تو اے یوسفِ گم گشتہ

گرگوں سے فزوں نکلے تیرے لیے بھائی بھی
بے امن و اماں ہے تو اے یوسفِ گم گشتہ

کچھ سہل نہیں بچنا ان بردہ فروشوں سے
قیمت میں گراں ہے تو اے یوسفِ گم گشتہ

اپنوں نے دیا تجھ کو غم چاہ نشینی کا
افسوس وہاں ہے تو اے یوسفِ گم گشتہ

تیرے لیے دنیا ہے ایوانِ زلیخا سی
پاکیزہ جواں ہے تو اے یوسفِ گم گشتہ

قصہ ہے عجب تیرا زندان سے شاہی تک
عبرت کا نشاں ہے تو اے یوسفِ گم گشتہ

گلزار تجھے بھولے کیسے کہ لہو بن کر
رگ رگ میں رواں ہے تو اے یوسفِ گم گشتہ

گلزار بخاری

مہر چمکے گا فلسطین میں آزادی کا

شمعِ اُمید جلانے سے اُجالا پھیلا
پرچمِ صبر اُٹھانے سے اجالا پھیلا
دل کے جذبات جگانے سے اُجالا پھیلا

وار چلنے کا نہیں اب کسی جلادی کا
آ گیا وقت یہودی تری بربادی کا
مہر چمکے گا فلسطین میں آزادی کا

نقشہ بدلے گا بہت جلد اِس آبادی کا
آ گیا وقت یہودی تری بربادی کا
مہر چمکے گا فلسطین میں آزادی کا

اے مسلمان ترے خون سے صحرا روشن
تیری لاشوں سے سمندر بھی ہے دریا روشن
اور تری کوششِ پیہم سے ہے دنیا روشن

مٹنے والا ہے نشاں ظلم کی صیادی کا
آ گیا وقت یہودی تری بربادی کا
مہر چمکے گا فلسطین میں آزادی کا

عہدِ ظلمت، نہ تباہی، نہ اندھیرا ہو گا
نہ کوئی عصمتِ مُسلم کا لُٹیرا ہو گا
تیرگی ختم ہوئی جلد سویرا ہو گا

ریاض ندیم نیازی

زندگی دُکھ ہے

ایک لمحے کی سرگزشت
صدی کے کونے کھدرے میں
کسی اجنبی مجسمے سے
خوشی کے بارے میں کیا پوچھے
وہی
جو کرداروں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے
ماضی کے نوادرات کا خزانہ
کبھی جدت کے نام پر طلوع ہوا تھا
نجانے کتنی آوازوں کا شور
صبح کی تازہ ہوا میں
مجھے جگانے کے لیے
رات کے پہلو سے نکل آیا ہے
کون جانے
دُکھ کی دلدل کے نیچے
قید خانوں کے فرش کا رنگ کیا ہے؟
سمندروں کا احوال
جھوٹی سچی خبروں کے نقوش
کتنے مدھم، معدوم اور مقسوم ہیں
زندگی
اپنے مزاج میں
فنا کا باب لکھتے لکھتے بوڑھی ہو چکی ہے
مگر تحیر کے عجائب خانے میں
نئے زاویوں کے جنم دن پر
شراکت کا اضافی بونس مل رہا ہے
وقت کے بے کراں بہاؤ کی
مسافت میں
دُکھ کا زنگار
ناآسودہ تمناؤں کا انبار ہے
نجانے کتنے دُکھ
گرتے پانیوں کو
روزانہ برف کرتے ہیں
اور کتنے نحیف و ناتواں
دل کے صحرا میں چُپ چاپ جلتے ہیں

امجد بابر

''مزدور کا خواب'' [نظم]

میرے بچّے سکول جائیں گے
کِسی اچھے سکول جائیں گے

میرا ذاتی مکان بھی ہو گا
اُس میں چھوٹا سا لان بھی ہو گا

ہو گی اپنی مِری سواری بھی
میں خریدوں گا ایک گاڑی بھی

صاف سُتھرا لِباس پہنوں گا
میں بھی اچھا لِباس پہنوں گا

ہو گی عِزّت بھی رِشتہ داروں میں
میں بھی بیٹھا کروں گا یاروں میں

کچھ تعلّق بناؤں گا میں بھی
اپنی دُنیا سجاؤں گا میں بھی

محمود کیفی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

میں کہ مفہوم ہوں پہنائی کا
وسعت سمجھیں نہ سمندر مجھ کو

تماشا

آ گیا وقت جس کو زمانے لگے
پتلیوں کے قدم لڑکھڑانے لگے
شعبدہ باز کی انگلیاں تھک گئیں
اب تماشہ گری ختم ہونے کو ہے

دیکھ لینا مرے وقت کے سامری
چلنے والی نہیں تیری جادوگری
تیری نابودیت کا ہوا فیصلہ
اب تری ساحری ختم ہونے کو ہے

اب ہواؤں کے تیور بدلنے لگے
لوگ پہنے کفن اب نکلنے لگے
رمسیس کو جا کر بتا دے کوئی
بادشاہت تری ختم ہونے کو ہے

کھیل کی تیری باری مکمل ہوئی
بردباری ہماری مکمل ہوئی
بومرانگ آنے والے ہیں تیری طرف
معرکہ آخری ختم ہونے کو ہے

تیرا خلقِ خدا کو پتہ چل گیا
ایک جنگل کا تو کاغذی شیر تھا
جو حقیقت تھی سب پر عیاں ہو چکی
اب تری برتری ختم ہونے کو ہے

صغیر احمد صغیر

جنازوں پر رقصاں لوگ

دن اور رات کا کھیل ہے جاری
لگی ہوئی ہے سب کی باری
کر کے بیٹھے ہیں تیاری
چھپے ہوئے ہیں ابھی شکاری
اور وہ تماشا دیکھ رہے ہیں
اُن زندوں کا
جو مُردہ ہیں
اور جنازوں پر رقصاں ہیں

چلتے پھرتے مُردوں جیسے زندہ لوگ
کلمہ شہادت پڑھتے پڑھتے خوف کے
مارے ہانپ رہے ہیں
اپنے جیسے مَرے ہوئے زندوں کو
اپنے ساتھ یوں چلتا پھرتا دیکھ کے
کانپ رہے ہیں
مَرے ہوئے سب
اِک دوجے کو کیسے پُرسہ دیں گے!
کیسے آپس میں بانٹیں گے درد کسی کا!
کیسے اِک دوجے کا وہ احوال سُنیں گے
کیسے اِک دوجے کو سہارا دیں گے!!

چہروں پر مصنوعی رونق
آنکھوں میں کچھ شرم، نہ آنسو
ڈھول کی تھاپ پہ آگے آگے محوِ رقص ہیں
جیسے جنازے ڈھوتے ڈھوتے
بھول گئے ہیں کاندھا دینا
یا پھر بے حس لوگ مسلسل
اپنی ہی بربادی کا
جشن منانے نکلے ہیں
مَرے ہوؤں کو خوف کے مارے
یوں دفنانے نکلے ہیں
بُھولی ہوئی ہیں پُرکھوں کی
رسمیں اپنے پہلوں کی

لیکن ایسا بھی ممکن ہے
بدل گئی ہوں ساری رسمیں
ٹوٹ گئی ہوں ساری قسمیں
عہد نیا ہے
سوچ نئی ہے
لوگ نئے ہیں
وقت سے آگے دیکھنے والے
اب تو شاید
مَرنے والوں کو ایسے دفناتے ہوں
ہوسکتا ہے اُن کا جشن مناتے ہوں

ظہور چوہان

نثری نظم

فراموشی اور خود فراموشی میں زیادہ فرق نہیں
کبھی کبھی بھلانے کے لئے خود کو بھولنا ضروری ہوتا ہے
جیسے ملنے کے لئے بچھڑنا
کچھ قربتیں جدائی سے مستعار لی جاتی ہیں
محبت ختم نہیں ہوتی
ہائبرنیشن میں چلی جاتی ہے
طویل مدت کے لئے

خود فراموشی کی دھند چھٹتے ہی
اپنے سرکل سے باہر نکلتی ہے
لیکن
دل کا
موسم اتنا بدل چکا ہوتا ہے
کہ وہ قدیمی چاہت قبول نہیں کرتا
محبت اداس رستوں پر
بھٹکتی رہتی ہے
ان لمحوں کی تلاش میں جو وقت کی ریزگاری بن کر کھو گئے

زندگی ایک تجریدی آرٹ ہی تو ہے
ہم معنی و مفہوم میں کھوئے رہتے ہیں کبھی کبھی
یہ جاننا کتنا مشکل لگتا ہے
آرٹسٹ کیا کہنا چاہتا تھا
ہم زندگی کو دل کے موسم کا مفہوم پہنا دیتے ہیں
خوش رہنے کے لئے خود فراموشی شرط ہے

نائلہ راٹھور

انسانیت کا نوحہ..... [نثری نظم]

ثناخوان تقدیس انسانیت کہاں ہیں
ارضِ فلسطین میں
انسانیت لُٹ رہی ہے، مٹ رہی ہے
شیر خوار بچے لہولہان ہیں
کہاں ہیں، کہاں ہیں
ثناخوان تقدیس انسانیت کہاں ہیں
وہ دیکھو
بچے بھوک سے بلبلا رہے ہیں
زخمی دوا کے لیے کراہ رہے ہیں
وہ دیکھو
گھروں پر
ٹینک گولے برسا رہے ہیں
اقوام متحدہ کے چارٹر کا
منہ چڑا رہے ہیں
وہ دیکھو
بموں نے ہسپتالوں کو مٹا ڈالا ہے
مریضوں، زخمیوں، بچوں کو
ڈاکٹروں اور نرسوں کو
خون میں نہلا ڈالا ہے
وہ دیکھو
لٹی پٹی انسانیت کے قافلوں کو
فاسفورس بموں سے جال پھیلایا جا رہا ہے
جنیوا کنونشن کا مذاق اڑایا جا رہا ہے

کہاں ہیں، کہاں ہیں
ثناخوان تقدیس انسانیت کہاں ہیں
وہ دیکھو
دیدہ دلیری دیکھو
یو این او کے دفاتر بھی

قاتلان انسانیت کے نرغے میں ہیں
کہاں ہیں یو این کے ترجماں
کیوں دیکھتے نہیں اہل زماں
انسانیت قتل ہو رہی ہے
سسک رہی ہے، بلک رہی ہے
تذلیل انسانیت کا یہ سماں
کیوں دیکھتے نہیں اہل جہاں
دیکھنے والے کہاں ہیں
کہاں ہیں، کہاں ہیں
ثناخوان تقدیس انسانیت کہاں ہیں

غزہ میں ظلم وستم کی انتہا
کوئی ہے جو سنے مظلوموں کی التجا
انسانی حقوق کے رکھوالے
امن کے پیامبر، امن مشن والے
دیکھتے نہیں کیا
معذوروں، ضعیفوں کا قتل
صحافیوں، ادیبوں کا قتل
شاعروں، استادوں کا قتل

ماؤں کی گودوں میں
نوزائیدہ بچوں کا قتل
کیسے ادا ہوگا ان کا خون بہا
کہاں ہیں، کہاں ہیں
ثناخوان تقدیس انسانیت کہاں ہیں

یہ کٹی پھٹی عزت مآب خواتین
یہ ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی توہین
یہ بے حرمتی کی انتہا
بے گور کفن لاشے، تڑپتی نسواں
کہاں ہیں، کہاں ہیں
علمبرداران حقوق نسواں

دودھ کی بوند سے محروم بلکتے بچے
مرہم پٹی سے محروم تڑپتے بچے
پانی کے گھونٹ سے محروم مرتے بچے
چلے گئے کہاں
حقوق بچگان کے نگہبان

خوف، بھوک، ڈیزاسٹر، سے لڑنے والے
وہ عظیم والنٹیئر، وہ ضخیم این جی اوز
کیوں پہنچ نہیں سکے غزہ میں
کیوں پکڑتے نہیں روکنے والوں کے گریباں

عالمگیریت کے حکمراں
کیوں بنے بیٹھے ہیں تصویر بتاں
دیکھیں ذرا غزہ میں
ضروریات زندگی کی بندش عریاں

کھانے کی بندش
پانی کی بندش
تعلیم کی بندش
گھروں میں رہنے کی بندش
کیمپوں میں جینے کی بندش
ہے عالمی طاقتوں سے پنہاں؟
کہاں ہیں، کہاں ہیں
ثناخوان تقدیس انسانیت کہاں ہیں

نہیں دیکھتے ان عالم کے پاسباں
انسانی المیہ، انسانیت کا زیاں
امن عالم کی تباہی کا سامان
امن عالم کے پاسبان کہاں ہیں
کہاں ہیں، کہاں ہیں
ثناخوان تقدیس انسانیت کہاں ہیں

یہ کیسا ان کا معیار ہے

انسانیت کی موت کا انتظار ہے
بے حسی ہے یا بے بسی ہے
انسانیت کا درد رکھنے والے
مقتدر قوتوں کی بے حسی پر
اپنی بے بسی پر
نوحہ کناں ہیں

ظہیر گیلانی

نظم

کوکی گل

نہ ایسی دشمنی کو ، تو ہوا دے
نشاں ہستی کے جو تیری ، مٹا دے

ارے پگلے! سنبھل جا ، دے نہ دھوکے
زمیں اپنی کو نا تو زلزلہ دے

سبق انسانیت کا اب بھی پڑھ لے
گرے کوئی اگر تو حوصلہ دے

گلستاں میں بچھے ہیں کانٹے لاکھوں
تو سارے راہ کے ،کانٹے جلا دے

جو بندے بھی فسادی ہیں یہاں پر
خدایا! راہ سے ان کو ہٹا دے

دعا کوکی کی ہے اپنے خدا سے
بچھڑنے والوں کو اب تو ملا دے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

فصل تو نے بوئی تھی، لیکن اسے کاٹیں گے ہم
دیکھ تو حدِ نظر تک لہلہاتی دوریاں

اگلی ہجرت کا دکھ

بستی پر شب خون پڑا تھا
رات کو دریا خوب چڑھا تھا
جب میں نکلا
گھر سے تنہا
اپنے دکھ کا بوجھ اٹھائے
بقچہ باندھے
اک روٹی،
چقماق کا پتھر،
اک مشکیزہ،
ٹوٹا خنجر
نازک سرکنڈوں کی ناؤ
لہروں لہروں مجھ کو لے کر
سات سمندر پار گئی تھی
بہہ نکلا تھا
وقت کا دھارا،
ایک نیا گھر
ساتھ ہمارا،
——یادوں کا پشتارہ

جانے کتنے موسم گزرے
پھر اک شب کو میں نے دیکھا
—— اک دُم دار ستارہ
صبح ہوئی تو
گونج رہا تھا
—— سادھو کا اکتارہ
جادو نگری اجڑ چکی تھی
زرد پڑا جاتا تھا لاغر
اجڑا بوسیدہ سیارہ
سنتا ہوں اب
پاس ہی جیسے
کوچ کا بجتا ہے نقارہ
اڑنے کو تیار ہے شاید
ایلومنیم کا راکٹ،
—— پیتل کا طیارہ

میں اپنی تنہائی لے کر
بقچہ باندھے
اک روٹی
چقماق کا پتھر
اک مشکیزہ
ٹوٹا خنجر
یادوں کا پشتارہ
اگلی منزل دور کہیں ہے
—— کالے پتھر کا فوارہ
اگلی ہجرت
عالم بالا میں اگلا سیارہ
—— وقت کنارہ

عابد رضا

نظم

عائشہ احمد جاوید

آوارہ پنچھی

اڑان جائز نہیں ہے

تیری محبت کا محاصرہ ہو چکا ہے

آسمان کی وسعت تجھ پر تنگ کر دی گئی ہے

تو جو غازی یا شہید ہونے کا خواہش مند ہے

تجھے ہلاکت کے لیے چنا گیا ہے

میں خود میں سمیٹوں خود میں ٹھہروں

کہ اس اضطراب میں

میں خود میں تم کو اور تم میں خود کو نہ پاؤں تو کیا سوچوں

مجھے حوصلہ دو اور ہاتھ بڑھاؤ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مر جائیں نہ ہم اے پند گرو، تم پرچمِ جام بلند کرو
اے آتشِ مے، اے تابشِ خم، کب گنبدِ مینا بیٹھ رہے

اضطراب

کئی دنوں سے
کہاں پہ گُم ہو!
سبھی کتابوں میں ڈھونڈ ڈالا
قدیم شیلفوں کو کھوج ڈالا
وہاں نہیں ہو
پُرانے البم بھی دیکھ ڈالے
نئے پُرانے سبھی رسالے، تلاش ڈالے
یہاں نہیں ہو، وہاں نہیں ہو
کہیں نہیں ہو

بصارتوں سے سماعتوں تک کی راہداری
عجیب وحشت میں اَٹ چکی ہے
کوئی اُداسی سی دُھند بن کے
مرے بدن سے لِپٹ رہی ہے
دِیا جلایا
بُجھا کے دیکھا
کہیں نہیں ہو، کہیں نہیں ہو

عظمیٰ نقوی

رائیگانی

لوگوں کے رویّے سے
دل کُڑھتا ہے
وہم و گماں میں بھی نہیں ہوتا
کوئی شخص عجب سی
بات کہہ جاتا ہے
کانٹا سا حلق میں پھنس جاتا ہے
کوئی شخص میرے نام پر
ایسے کچھ کر جاتا ہے
ہر جانہ بھرتے بھرتے
عمر گزر ہو جاتی ہے
اپنے پرائے سب ایک جیسے ہیں
کوئی کسی کا نہیں
کس کا گِلہ کریں، کس سے شکوہ کریں
کہیں اخلاص نہیں ہے
کہیں احساس نہیں ہے
ایسے بے حس لوگوں میں
جینا بھی مرنے کے برابر ہے

امر مہکی

سگِ بیمار کو وصیّت 2024

سگِ بیمار اپنے مالکوں پر کچھ بھروسہ کر

ترے مالک بہت اعلیٰ نسب کے ہیں

اُنھیں تیری بقا کی فکر لاحق ہے

تری زنجیر ڈھیلی ہے

ترے قدموں تلے ویران رستہ ہے

تو دھیمی چال چلتا گاؤں میں جس سمت جائے گا

ترے مالک کے ٹکڑوں پر پلے دو چار بندے تو

تری جانب یوں لپکیں گے کہ جیسے تُو نہیں تیری جگہ

مالک کی آمد ہے

سگِ بیمار میری سُن!

تجھے کیا گاؤں کی رونق گھٹے یا نہر میں پانی

تجھے کیا روٹیاں جل جائیں یا سب ڈھور مر جائیں

تجھے تو مالکوں کے ساتھ رہنا ہے

ہر اک آزار سہنا ہے

سمے کے ساتھ بہنا ہے

اعجاز رضوی

ایسا کیوں ہے؟ [یوم مزدور]

مالک میرے
بھاری پتھر ڈھونے والے
بھوکے پیاسے سونے والے
چپکے چپکے رونے والے
ڈرتے ڈرتے جینے والے
تیرے ہی بندے ہیں یا پھر اُن کا کوئی اور خدا ہے
مالک میرے
ایسا کیوں ہے

اک جنت کے وعدے پر تُو
پل پل دوزخ میں رکھتا ہے
ایسا کیوں ہے

ایسا کیوں ہے
اک روٹی کی خاطر بندہ
سب کچھ گروی رکھ دیتا ہے
اور اک بندہ سب کچھ گروی رکھ لیتا ہے
مالک میرے
دھرتی پر تُو نے بھیجا تھا
دھاتیں، پتھر، پیڑ، پرندے
تُو نے میرے بعد بنائے
لیکن یہ سب مجھ سے آگے کیوں رہتے ہیں
مجھ پر بھاری کیوں پڑتے ہیں

اعجاز رضوی

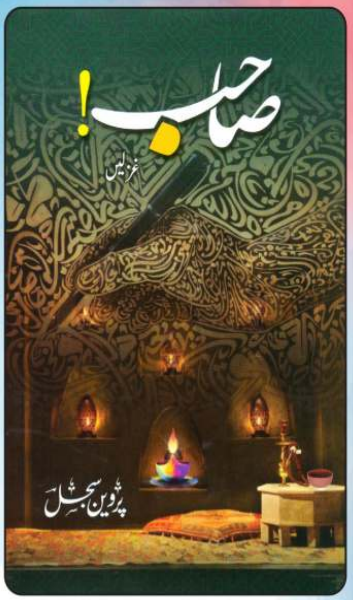

صاحب!
غزلیں
پروین سجل

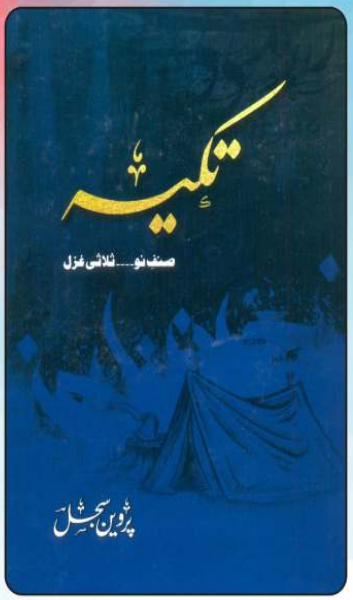

تکیہ
صنفِ نو.... ثلاثی غزل
پروین سجل

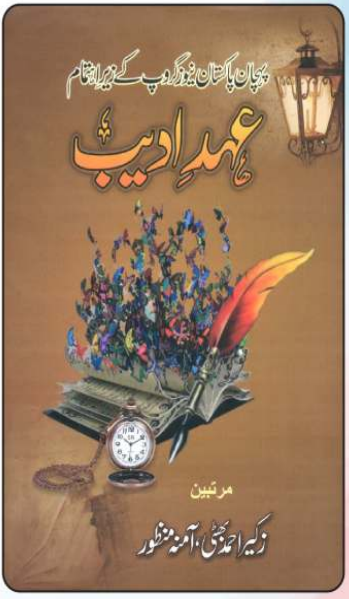

پہچان پاکستان نیوز گروپ کے زیرِ اہتمام
عہدِ ادیب
مرتبین
زکیر احمد بھٹی ۔ آمنہ منظور

نقد و نظر
یوسف خالد کی نثری نظمیں
(نامور ناقدین کی نظر میں)
ترتیب و تدوین
ذوالفقار احسن

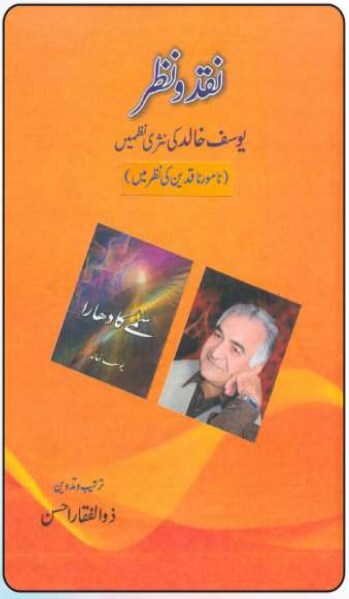

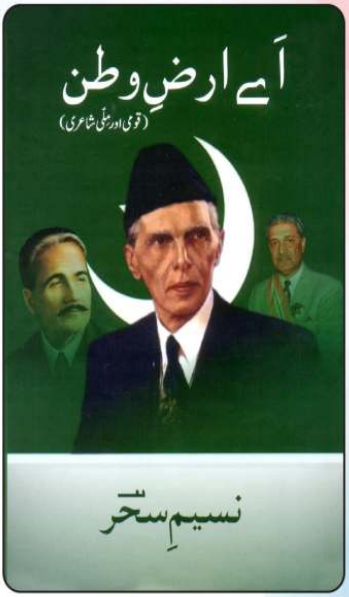
اے ارضِ وطن
(قومی اور ملی شاعری)
نسیمِ سحر

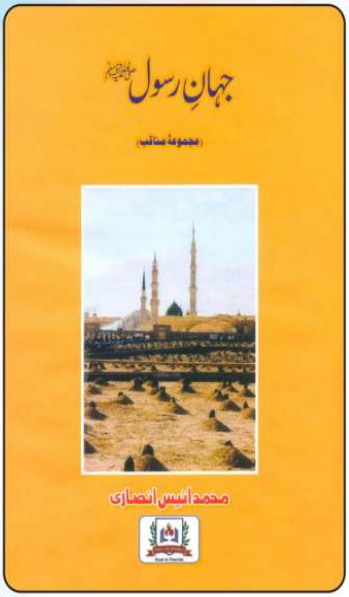
جہانِ رسول ﷺ
(مجموعۂ مناقب)
محمد انیس انصاری

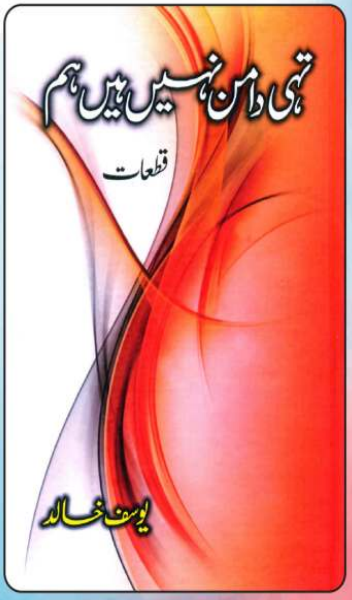
تہی دامن نہیں ہیں ہم
قطعات
یوسف خالد

اگر تم مہرباں ہوتے
مسعود تنہا